محمد محمدی اشتہاردی

عباد الرحمٰن کے اوصاف

(سورہ فرقان کی آخری آیات کی روشنی میں)

دار الثقلین

عباد الرحمٰن کے اوصاف

(سورۂ فرقان کی آخری آیات کی روشنی میں)

تالیف

محمد محمدی اشتہاردی

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دار الثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳- کراچی ۷۴۶۰۰- پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: عبادالرحمٰن کے اوصاف

تالیف: محمد محمدی اشتہاردی

ترجمہ: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دارالثقلین

طبع اوّل: رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء

طبع سوم: شوال ۱۴۲۹ھ، اکتوبر ۲۰۰۸ء

قیمت: ۷۵ روپے

فہرست

☆عرضِ ناشر ——— ۷

☆تواضع وانکساری ——— ۹

پہلی خصوصیت: تواضع وانکساری ——— ۹

خدا کے مقابل تواضع وانکساری ——— ۱۰

لوگوں کا آپس میں انکساری سے پیش آنا ——— ۱۳

رسولِ کریم کی انکساری کی ایک جھلک ——— ۱۴

حضرت علی کی تواضع وانکساری کی ایک جھلک ——— ۱۶

مثبت اور منفی انکساری ——— ۱۸

☆حلم اور ضبطِ نفس ——— ۲۱

قرآنِ مجید کی رو سے حلم اور غصہ ضبط کرنے کا مفہوم ——— ۲۲

قرآن کریم کی نظر میں ضبطِ نفس کی اہمیت ——— ۲۵

پیغمبر اسلام اور ائمۂ معصومین کی گفتار و کردار میں حلم کی اہمیت ——— ۲۷

حلم اور ضبطِ نفس کے مثبت اثرات ——— ۳۲

☆عبادتِ الٰہی میں خلوص و معرفت ——— ۳۵

عبادت اور اس کا فلسفہ ——— ۳۶

عارفانہ اور مخلصانہ عبادت ۴۰
☆ خوف وخشیتِ الٰہی ۴۵
قرآن کی نظر میں خوف اور اسکے مراتب ۴۷
پیغمبر اسلام اور ائمۂ اطہار کے کلام میں خوف کی اہمیت ۵۰
تجزیہ وتحلیل اور جمع بندی ۵۱
☆ انفاق اور خرچ میں اعتدال ۵۵
اسلام میں فضول خرچی کی مذمت ۵۶
امام خمینی کا فضول خرچی سے شدید پرہیز کرنا ۶۰
گھرانے کی معاشی ضروریات میں سخت گیری سے پرہیز ۶۱
☆ ہر طرح کے شرک سے پرہیز ۶۵
قرآنِ کریم میں مشرکین کی مثالیں ۶۷
شرک کے معنی کی وسعت اور اسکے مختلف پہلو ۷۰
توحید کی اہمیت اور شرک کی ناپسندیدگی ۷۴
☆ انسانی قتل اور ایذا رسانی سے اجتناب ۷۷
انسان کے قاتلوں کے لئے قصاص اور دیت کی شدید سزائیں ۷۹
پیغمبر اسلام اور ائمہ کے اقوال میں انسانی قتل کا گناہ ۸۳
انسانی قتل میں تعاون کا گناہ ۸۶
☆ ناجائز صنفی تعلقات سے سخت اجتناب ۸۹
جنسی آلودگی سے پرہیز اور محفوظ رہنے کے راستے ۹۱
بے عفتی کے خلاف پیغمبر اسلام کا شدید موقف ۹۵
☆ گناہ کی محفلوں میں شرکت سے پرہیز ۹۷
۱۔ جھوٹی گواہی سے پرہیز ۹۸
۲۔ بیہودہ محفلوں میں شرکت سے پرہیز ۱۰۲
نتیجہ اور خلاصہ ۱۰۳

☆ فضول کاموں اور وقت کے زیاں کی مخالفت ۱۰۵
قرآن وحدیث کی نگاہ میں لغو سے اجتناب ۱۰۶
وقت کی پہچان اور اسکی اقدار ۱۰۸
وقت کی قدر اور لغویات سے پرہیز کے خوبصورت نتائج ۱۱۱
☆ قرآنِ کریم سے درست استفادہ ۱۱۵
قرآنِ مجید میں غور وفکر اور اس پر عمل حضرت علی کی نظر میں ۱۱۹
قرآنِ کریم سے صحیح استفادے کی چند مثالیں ۱۲۱
☆ دعا اور اسکے مضامین پر توجہ ۱۲۷
اسلام میں دعا کی اہمیت ۱۲۸
دعا کی روشنی میں تین اہم سبق ۱۲۹
دعا کے مضمون پر توجہ اور بے موقع یا کم فائدہ دعاؤں سے اجتناب ۱۳۱
دعا میں تین خوبصورت خواہشیں ۱۳۴
اچھی بیوی اور اسکے اثرات ۱۳۵
صالح اولاد ۱۳۶
لوگوں کا پیشوا اور قائد ہونا ۱۳۸
☆ عبادالرحمٰن کی عظیم الشان جزا ۱۴۱
جزا و پاداش ۱۴۱
عبادالرحمٰن کا خصوصی ثواب ۱۴۳
خلود وجاودانگی کی اہمیت ۱۴۴
☆ صبر واستقامت کی اہمیت ۱۴۹
تجزیہ اور تحلیل ۱۵۰
عبادالرحمٰن کی ان بارہ خصوصیات سے صبر کا تعلق ۱۵۲
فرامینِ معصومین میں صبر کے اثرات اور اس کا کردار ۱۵۳

عرضِ ناشر

قران کریم انسانوں کی ہدایت اور ان کی رہنمائی کے لئے نازل ہونے والی کتاب ہے۔اسکا مخاطب عالمِ انسانیت ہے۔اسمیں انسان کی خلقت'اسکی خصوصیات'اسکی منزلت'اسکے مقصدِ تخلیق اور اسکی ہدایت ورہنمائی سے تعلق رکھنے والے تمام امور کا تذکرہ ہوا ہے۔اسی کتاب ہدایت میں اُن پسندیدہ صفات وخصوصیات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو خداوند عالم انسان میں دیکھنا چاہتا ہے'اور پروردگارِ عالم کی نظر میں ناپسندیدہ صفات بھی اسمیں بیان کی گئی ہیں۔وہ امور بھی بیان ہوئے ہیں جن کی جانب رب العالمین نے انسانوں کو شوق ورغبت دلائی ہے'اور ایسے امور سے اجتناب کی تاکید بھی کی گئی ہے جو دنیا اور آخرت میں انسان کی تباہی وبربادی کی وجہ بنتے ہیں۔

زیرِنظر تالیف قرآنِ مجید کے پچیسویں سورے'سورۂ فرقان کی آخری چند آیات کی تشریح و تفسیر پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ان آیات میں خداوند عالم نے اپنے خاص اور ممتاز بندوں کو عبادالرحمٰن قرار دیتے ہوئے ان کی بارہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے'اور ان کے انفرادی واجتماعی کردار کی تصویر کشی کی ہے۔

حوزۂ علمیہ قم کے ممتاز اساتید میں شمار ہونے والے حجت الاسلام محمد محمدی اشتہاردی نے یہ مضامین حوزۂ علمیہ قم سے شائع ہونے والے ماہنامے ''پاسدارِ اسلام'' کے لئے تحریر کئے جن کا

اردو ترجمہ ''دو ماہی رسالت کراچی'' میں قسط وار شائع کیا گیا۔ اب ان مضامین کو کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے دار الثقلین کی دوسری کتب کی طرح یہ کتاب بھی قارئین میں پسند کی جائے گی۔

تواضع وانکساری

قرآن مجید کی سورۂ فرقان میں خداوند عالم نے عباد الرحمٰن (خدا کے خاص بندوں) کی تعریف وستائش کی ہے اور اس سورے کی آیات نمبر ۶۳ سے ۷۴ تک میں اپنے ان بندوں کی بارہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ دیا ہے کہ: اُولٰئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ یُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا (یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے صبر واستقامت کی وجہ سے (جزائے الٰہی کے طور پر) بہشت کے بلند محل عطا کئے جائیں گے اور وہاں انہیں تعظیم وسلام پیش کئے جائیں گے۔ سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۷۵)

عباد الرحمان کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ ان بارہ خصوصیات و امتیازات کا ذکر کریں، اور بارہ علیحدہ علیحدہ مضامین کی صورت میں ان میں سے ہر خصوصیت کو مختصراً بیان کریں، اس امید کے ساتھ کہ ان اعلیٰ اقدار وصفات سے متصف ہو کر ہم بھی کمال کے مدارج طے کر سکیں اور عباد الرحمٰن یعنی خداوند سبحان کے خاص اور ممتاز بندوں کی صف میں شامل ہو سکیں۔

پہلی خصوصیت: تواضع وانکساری

قرآن مجید، خداوند عالم کے خاص بندوں کی پہلی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (وہ جو زمین پر آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵-

آیت ۶۳) یعنی عباد الرحمٰن وہ لوگ ہیں جو آہستہ قدموں اور کسی قسم کے غرور و تکبر کے بغیر زمین پر چلتے ہیں۔

تواضع کے معنی ہیں' عاجزی وانکساری۔ جبکہ اسکی ضد تکبر اور خود پسندی ہے جو غرور' غفلت اور سرکشی کی وجہ بنتی ہے' جس کی بنا پر انسان گمراہ' بے راہ رو اور تباہ ہو جاتا ہے۔

تواضع وانکساری دو طرح کی ہوتی ہے:

۱۔ خدا کے سامنے عاجزی وانکساری' جو عبودیت و بندگی کے بنیادی خواص میں سے ہے' اور جس کے بغیر بندگی کا جوہر پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ باایمان انسانوں کے ساتھ انکساری اور فروتنی سے پیش آنا۔ یا اُن انسانوں کے سامنے تواضع و فروتنی جن کے مقابل عاجزی وانکساری کا اظہار مثبت اثرات کا حامل ہوتا ہے اور ان میں اعلیٰ اقدار و صفات کی جانب رغبت کا سبب بنتا ہے۔

خدا کے مقابل تواضع وانکساری

خدا کے سامنے عاجزی اور انکساری کی علامت یہ ہے کہ انسان اسکے فرامین تسلیم کرے' اسکی اطاعت بجالائے اور اسکی عظمت کے سامنے انتہائی خضوع و خشوع کا اظہار کرے۔ اس پر یہ کیفیت اس حد تک طاری ہو کہ اسے جو کچھ حاصل ہے اس سب کچھ کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اسکی مخلوقات میں سے ایک ناچیز ذرّہ سمجھے۔ بے چوں و چرا اسکا شاکر و سپاس گزار رہے اور خدا کی مرضی کے سامنے اپنی کسی بھی قسم کی مرضی چلانے سے پرہیز کرے۔

خداوند عالم کے سامنے عاجزی وانکساری' ایمان و معرفت کی کنجی اور درگاہِ حق اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسکے برعکس خدا کے سامنے تکبر اور گھمنڈ اس سے سرکشی اور بغاوت کا موجب اور ہر قسم کی بدبختی اور گمراہی کا سبب ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے روایت کی گئی ہے کہ آنحضرت پروردگارِ عالم کی عظمت و بزرگی کے مقابل انتہائی تواضع و عاجزی کے حامل تھے' یہاں تک کہ جب خدا نے انہیں اختیار دیا کہ رسول اور بندہ بن کر رہیں یا رسول اور بادشاہ بن کر ہر

صورت میں خدا کے نزدیک ان کے مقام میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی' تب بھی آنحضرت نے بندگی اور رسالت کا انتخاب کیا اور خدا کا عاجز بندہ اور رسول بننا پسند کیا' رسول اور بادشاہ بننا قبول نہ کیا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: **ما اکل رسول اللہ (ص) متکئاً منذ بعثه اللہ عزّ وجلّ نبیّاً حتیّ قبضه اللہ الیه' متواضعاً للہ عزّ وجلّ** (جب سے رسول اللہ رسالت کے لئے مبعوث ہوئے تھے' اس وقت سے اپنی عمر کے اختتام تک خداوند عالم کے مقابل عاجزی وانکساری کی بنا پر کبھی آپ نے کسی چیز پر ٹیک لگا کر غذا تناول نہیں فرمائی۔ کحل البصر۔ ص ۱۰۰' ۱۰۱۔ از محدث قمی)

ایک دن آنحضرت چند غلاموں کے ساتھ زمین پر تشریف فرما' کھانا کھانے میں مشغول تھے کہ وہاں سے ایک گستاخ عورت کا گزر ہوا۔ آنحضرت کو اس طرح تشریف فرما دیکھ کر اس عورت نے کہا: اے محمد! خدا کی قسم آپ بندوں (غلاموں) کی مانند کھانا کھا رہے ہیں اور انہی کی مانند بیٹھے ہوئے ہیں (آپ کی روش اور انداز بادشاہوں اور حکمرانوں کا سا نہیں ہے) پیغمبر اسلام نے اسے جواب دیا: **ویحک ای عبد اعبد منی** (وائے ہو تجھ پر' کونسا بندہ مجھ سے بڑھ کر بندہ (غلام) ہوگا۔ حوالۂ سابق۔ ص ۱۰۱)

خداوند عالم کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کی تواضع وانکساری کے بارے میں روایت کی گئی ہے کہ آپ کثرت کے ساتھ غربا اور ضرورت مندوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک شخص نے تنقید کے طور پر آپ سے عرض کیا: آپ اس قدر افراط کے ساتھ صدقہ کیوں دیا کرتے ہیں' اپنے لئے کوئی چیز کیوں نہیں بچاتے؟۔ آپ نے جواب دیا: ہاں! خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ خداوند عالم میرے انجام دیئے ہوئے کسی عمل یا فریضے کو قبول کر رہا ہے' تو میں اس افراط کے ساتھ خرچ کرنے سے پرہیز کرتا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرے اعمال بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو رہے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ مجھے اس بارے میں اطلاع نہیں اس لئے (راہِ خدا میں) اس قدر خرچ کرتا ہوں' تا کہ ان میں سے کوئی ایک قبول ہو جائے۔ (الغارات۔ ج ۱۔ ص ۹۱۔ از ابراہیم بن محمد ثقفی)

یہ واقعہ خداوند بزرگ و برتر کے مقابل حضرت علی علیہ السلام کی انتہائی تواضع و انکساری اور آپ کے خضوع و خشوع کو ظاہر کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ آپ توحید افعالی کی عظیم بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے انتہائی ناچیز سمجھتے تھے۔

پاک و پاکیزہ عارف "ورام بن ابی فراس" بیان کرتے ہیں کہ ایک شہر میں اولیا اللہ میں سے ایک عمر رسیدہ بزرگ رہا کرتے تھے۔ اس شہر میں زلزلہ اور طوفان آیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے اور بہت سے بے گھر ہو کر مصائب و ابتلا کا شکار ہو گئے۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور مشکلات کے حل کے لئے ان سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔

یہ لوگ جمع ہو کر ان پارسا بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بد حالی اور ابتر صورتحال کا ذکر کیا' اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ یہ بزرگ خدا کے سامنے انتہائی فروتنی اور عاجزی کا اظہار کرنے لگے اور روتے ہوئے ان لوگوں سے کہا: کہیں ایسا نہ ہو کہ میں خود ہی اس ہلاکت اور تمہارے مصائب کا ذمے دار ہوں۔ لہٰذا اس فقیر ناچیز اور گناہ گار سے دعا اور اسکی استجابت کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ (تنبیہ الخواطر۔ ص ۳۰۲۔ از ورام بن ابی فراس)

جی ہاں! پاک و پاکیزہ عرفا اور اولیا اللہ پروردگار عالم کی عظمت کے سامنے اس انداز سے خاضع و متواضع ہوتے ہیں۔ کیا خداوند عالم نے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا ہے کہ: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ (اے انسانوں! تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۱۵)

امام زین العابدین علیہ السلام اپنی ایک دعا کے ایک حصے میں خداوند متعال سے عرض کرتے ہیں کہ: یا غنیّ الاغنیاء ھا' نحن عبادک بین یدیک' وانا افقر الفقراء الیک' فاجبر فاقتنا بوسعک. (اے بے نیازوں میں سب سے زیادہ بے نیاز! اب ہم تیرے بندے' تیری بارگاہ میں حاضر ہیں اور تیرے فقیروں میں سب سے زیادہ فقیر میں ہوں پس ہماری تہی دستی کا اپنی تونگری کے ذریعے ازالہ فرما۔ صحیفۂ سجادیہ۔ دعا ۱۰)

لوگوں کا آپس میں انکساری سے پیش آنا

تواضع و انکساری کی ایک قسم دوسرے انسانوں کے ساتھ' والدین کے ساتھ' ہمسایوں کے ساتھ' دوستوں کے ساتھ' رشتے داروں کے ساتھ اور عام لوگوں کے ساتھ انکساری اور عاجزی سے پیش آنا ہے۔

عاجزی و انکساری کا طرزِ عمل انسانوں کے باہمی تعلقات میں استحکام اور ان کے درمیان محبت و الفت میں اضافے کا موجب ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کے مابین خلوص و صفا میں اضافہ ہوتا ہے' اور معاشرے سے ہر قسم کی کدورت' بدگمانی اور دوسرے مذموم اثرات مثلاً غرور و تکبر اور خود پسندی ختم ہو جاتے ہیں۔

عاجزی و انکساری' معاشرے میں انسان کے احترام اور اسکے وقار کی بلندی کا سبب بن کر باہمی اعتماد اور سکون و راحت کا باعث بنتی ہے۔ یہ صفت انسان کے اخلاق کو زینت بخشتی ہے اور اچھے تعلقات اور مخلصانہ روابط کو مضبوط کرتی ہے' انسانوں کو حق کے سامنے تسلیم کر کے ہر قسم کی جارحیت اور دوسروں کے حقوق پامال کرنے سے روکتی ہے۔ مختصر یہ کہ عاجزی' انکساری اور فروتنی بہت سی انفرادی و اجتماعی' معنوی و اخلاقی برکات کا سرچشمہ ہے۔

قرآن کریم نے' زیرِ بحث آیت میں اس اخلاقی صفت کو خدا کے ممتاز بندوں کی اولین خصوصیت قرار دیا ہے اور اس کی علامت "انکساری اور آہستگی سے چلنا" ہے جو دوسروں کے دل میں محبت اور پسندیدگی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: علما کی ہمنشینی تمہیں تین چیزوں سے دوسری تین چیزوں کی جانب لے جاتی ہے: (۱) تکبر سے تواضع و انکساری کی طرف۔ (۲) بے تعلقی سے احساسِ ذمے داری اور نصیحت کرنے کی طرف۔ (۳) جہل و نادانی سے علم و دانش کی طرف۔ (مجموعۂ ورام۔ ص ۲۳۳)

البتہ تواضع و انکساری کی مختلف صورتیں ہوا کرتی ہیں' ان میں سے ایک واضح ترین صورت راستہ چلنے کا انداز ہے۔ بعض افراد غرور اور تکبر کی بنا پر اس انداز سے چلتے ہیں جیسے زمین کا سینہ

چاک کر دینا چاہتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرت لقمان کی اپنے فرزند کو کی جانے والی نصیحتوں میں آیا ہے کہ آپ نے اس سے فرمایا: وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (اور خبردار لوگوں کے سامنے اکڑ کر ان سے منہ نہ پھیر لینا اور زمین پر غرور کے ساتھ نہ چلنا کہ خدا اکڑنے والے اور مغرور کو پسند نہیں کرتا۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۸)

خداوند عالم نے پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے: وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا (اور روئے زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کہ نہ تم زمین کو شق کر سکتے ہو اور نہ سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہو۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۷)

سچ ہے' اگر انسان خود اپنے آپ اور کائنات کے بارے میں معمولی سی معرفت و شناسائی بھی رکھتا ہو تو جان لیتا ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات کے مقابل وہ کس قدر معمولی اور حقیر ہے' خواہ اگر وہ اپنی گردن لمبی کرتے ہوئے پہاڑوں کی بلندیوں کو بھی چھو لے۔ جبکہ حال یہ ہے کہ زمین پر موجود بلند ترین پہاڑ بھی زمین کی عظمت کے سامنے کچھ نہیں اور خود زمین عظیم کہکشاؤں کے سامنے ایک ناچیز ذرّہ ہے۔

یہ سب جاننے کے باوجود انسان کا کبر و غرور میں مبتلا ہونا کیا اسکے مطلق جہل و نادانی کی دلیل نہیں؟

مختصر یہ کہ تواضع و انکساری اور عاجزی و خاکساری کا اظہار متقین کے خاص امتیازات میں سے ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے متقین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ومشيهم التواضع (اور ان کی چال منکسرانہ ہوتی ہے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۲)

رسولِ کریم کی انکساری کی ایک جھلک

سیرت نویسوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں لکھا ہے کہ: ایک دن آنحضرت ایک گروہ کے پاس گئے (وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے)۔ آنجناب کو اپنے درمیان دیکھ کر وہ

لوگ احتراماً ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رسول کریم نے ان کے اس عمل کو پسند نہ کیا اور فرمایا: اس طرح کھڑے نہ ہوا کرو جس طرح اہلِ عجم ایک دوسرے کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد لوگ رسول اللہ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت کو یہ بات پسند نہیں۔ آنحضور جب کسی مجلس میں آتے تو اس مجلس میں کمتر درجے کی جگہ پر تشریف فرما ہوتے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: پیغمبر اسلام کی انکساری اور عاجزی میں سے یہ بھی ہے کہ آپ برہنہ پشت گدھے پر سوار ہونا اور خاک پر بیٹھنا پسند فرماتے تھے۔ آپ غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر غذا تناول فرماتے اور سائلوں کو خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پہنچاتے۔ آپ گدھے پر سوار ہوتے اور اپنے غلام یا کسی دوسرے شخص کو اپنے پیچھے بٹھاتے۔

آنحضرت کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ انتہائی انکساری کے ساتھ دسترخوان پر تشریف فرما ہوتے' اور کھانا کھاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو چاٹتے جاتے۔ اپنے مویشیوں کا دودھ خود دوھتے اور اپنے پھٹے کپڑوں اور جوتوں کی سلائی خود کرتے۔ گھر میں جھاڑو لگاتے اور اپنے اونٹ کو خود اپنے ہاتھوں سے اصطبل میں باندھتے' اپنے گھریلو ملازم کے ساتھ مل کر گندم اور جو پیستے' اسکے آٹے کو خمیر کرتے' گھریلو ضروریات کی اشیا بازار سے خرید فرماتے اور انہیں اٹھا کر گھر تک لاتے۔ فقرا کے ساتھ بیٹھتے اور ان کے ساتھ غذا تناول فرماتے' اور خود اپنے ہاتھوں سے انہیں کھانا دیتے۔ (کحل البصر۔ ص ۱۷۷۔ از محدث قمی)

ایک روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہجوم لگائے کھڑے ہیں۔ نزدیک تشریف لے گئے اور فرمایا: کیا بات ہے' کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے ایک شخص کی جانب اشارہ کیا اور کہا: یہ ایک دیوانہ ہے' جو اپنی مضحکہ خیز حرکات اور باتوں سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کئے ہوئے ہے۔ لوگ اسکا تماشا دیکھنے کے لئے یہاں جمع ہیں۔

پیغمبر اسلام نے ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ان سے فرمایا: یہ شخص بیماری میں مبتلا ہے۔ کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں تمہیں حقیقی دیوانے سے متعارف کراؤں؟ ان لوگوں نے کہا: جی

ہاں۔ آپ نے فرمایا: المتبختر فی مشیہ' الناظر فی عطفیہ' المحرک جنبیہ بمنکبیہ الذی لایرجی خیرہ' ولا یومن شرہ. (حقیقی دیوانہ وہ شخص ہے جو تکبر اور غرور کے ساتھ راستہ چلتا ہے' مسلسل اپنے دائیں بائیں دیکھتا جاتا ہے اور اپنے پہلوؤں کو اپنے شانوں سے ہلاتا جاتا ہے۔ (صرف اپنے آپ میں مگن رہتا ہے) لوگوں کو اس سے خیر کی کوئی امید نہیں ہوتی اور اسکے شر سے امان میں نہیں ہوتے۔ المواعظ العددیہ۔ ص ۱۷۵۔ از شیخ حر عاملی)

حضرت علی کی تواضع وانکساری کی ایک جھلک

حضرت علی علیہ السلام بھی اپنی زندگی کے ہر پہلو میں انتہائی حد تک تواضع وانکساری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ اس قدر فروتن اور خاکسار تھے کہ پیغمبر اسلام نے آپ کو ابوتراب کہا اور آپ کو پسند تھا کہ لوگ آپ کو اس نام سے پکاریں۔

تاریخ میں آیا ہے کہ "غزوہ عشیرہ" کے موقع پر جب اسلامی سپاہ محاذ پر پہنچیں اور دشمنوں اور شر پسندوں کو اس علاقے سے نکال دیا تو حضرت عمار یاسر کے بقول: ہم اس محاذ پر ایک بیابان میں تھے۔ حضرت علی نے مجھ سے فرمایا: کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کسانوں کے پاس چلیں جو (اس علاقے کے نزدیک) اس چشمے کے کنارے کام میں مشغول ہیں اور ان کے کام کرنے کا طریقہ دیکھیں؟ میں نے رضامندی کا اظہار کیا اور ہم اکٹھے اس جگہ گئے اور قریب سے ان کے کام کرنے کا انداز دیکھا۔ پھر ان کے نزدیک ہی کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ تلے آرام کی غرض سے زمین پر لیٹ کے سو گئے۔ پیغمبر اسلام نے آ کر ہمیں بیدار کیا اور حضرت علی سے فرمایا: اے ابوتراب اٹھ بیٹھئے۔ علی اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے لباس پر لگی ہوئی گرد وغبار کو جھاڑا۔ اس طرح علی اس لقب سے معروف ہو گئے۔ (کحل البصر۔ ص ۱۹۳۔ از محدث قمی)

حضرت علی علیہ السلام کی حیات طیبہ کا ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ وہ ہے جسے امام حسن عسکری علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے' فرماتے ہیں: ایک باپ اور اسکا بیٹا حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے (یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ زمانہ آپ کا دور خلافت تھا) حضرت نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ انہیں صدر مجلس میں جگہ دی۔ خود انتہائی انکساری کے ساتھ ان کے سامنے تشریف فرما

ہوئے اور کھانا لانے کو کہا۔ کھانا لایا گیا اور مہمانوں نے اسے تناول کیا۔ اسکے بعد قنبر لوٹا اور لگن لے کر حاضر ہوئے تا کہ ان کے ہاتھ دھلا دیں۔ حضرت علی' باپ کے ہاتھ دھلانے کے لئے خود کھڑے ہوئے۔ اس نے جب یہ دیکھا تو اس بات پر تیار نہ ہوا اور شدید اصرار کیا کہ آپ اس کے ہاتھ نہ دھلائیں۔ لیکن حضرت علی راضی نہ ہوئے اور بالآخر پانی ڈال کر اسکے ہاتھ دھلوائے۔

اس شخص نے حضرت سے عرض کیا: میرے لئے انتہائی شرمندگی کی بات ہے کہ خداوند عالم مجھے اس حال میں دیکھے کہ آپ میرے ہاتھ دھلا رہے ہوں۔

حضرت نے اسے جواب دیا: نہیں' یہ تو بہترین حالت ہے' کیونکہ خداوند عالم دیکھ رہا ہے کہ تمہارا بھائی کسی قسم کے امتیاز کے بغیر تمہاری خدمت کر رہا ہے اور اس خدمت سے اسکا مقصد بہشت کے کئی گنا اجر وثواب کا حصول ہے۔

اسکے بعد حضرت علی نے لوٹا اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو دیا اور فرمایا: اب بیٹے کے ہاتھ تم دھلاؤ۔ بیٹا! اگر یہ تنہا یہاں آیا ہوتا تو اسکے ہاتھ میں دھلاتا لیکن خداوند عالم کو یہ بات پسند نہیں کہ کسی جگہ باپ اور بیٹا ایک ساتھ ہوں اور ان کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ لہٰذا تمہارے باپ نے اسکے باپ کے ہاتھ دھلائے ہیں اور اب تم بیٹے کے ہاتھ دھلاؤ۔ محمد بن حنفیہ نے بیٹے کے ہاتھ دھلائے۔

اسکے بعد امام حسن عسکری نے فرمایا: فمن اتبع علیاً علی ذالک فھو الشیعی حقاً (جو اس بات میں علی کی پیروی کرے وہ ان کا حقیقی شیعہ ہے۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۱۰۵' بحار الانوار۔ ج ۴۱۔ ص ۵٦)

حضرت علی کی تواضع وانکساری کے بارے ہی میں "زید بن علی" نقل کرتے ہیں: آپ پانچ مقامات پر اپنی جوتیاں ہاتھ میں اٹھا کر برہنہ پا چلا کرتے تھے۔ (۱) عید فطر کے دن نماز کے لئے جاتے وقت (۲) عید قرباں کے دن نماز کے مقام پر جاتے وقت (۳) جمعہ کے دن نماز جمعہ کے لئے جاتے وقت (۴) کسی بیمار کے گھر اس کی عیادت کے لئے جاتے ہوئے (۵) اور تشیع جنازہ کے وقت۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ مواقع خدا سے منسوب ہیں اور مجھے اس قسم کے مواقع پر

(انکساری اور تواضع کے اظہار کے لئے) برہنہ پا چلنا پسند ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک دن حضرت علی علیہ السلام سواری پر سوار کہیں سے گزر رہے تھے۔ آپ کے چند اصحاب آپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ آپ نے ان اصحاب کی طرف رخ کیا اور فرمایا: کیا تم لوگوں کی کوئی حاجت ہے؟ ان لوگوں نے عرض کیا: نہیں، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے ہمراہ اسی طرح چلیں۔ آپ نے فرمایا: **انصرفوا وارجعوا فان المشی خلف اعقاب الرّجال مفسدة للقلوب** (جاؤ، واپس چلے جاؤ، اس طرح لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنا (ان کے) قلوب کی تباہی کی وجہ بن جاتا ہے۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۲۔ ص ۱۰۴)

یعنی ممکن ہے یہ عمل اس شخص کو خود پسندی میں مبتلا کر دے جس کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار جا رہا ہے اور اس سے عاجزی و انکساری کی خصلت چھین لے اور نتیجے میں معنوی لحاظ سے اسکی روح اور قلب تباہ اور بیمار ہو جائے۔

جی ہاں! پیغمبر اسلام، حضرت علی اور دیگر اولیا اللہ اسی قدر منکسر المزاج تھے، عمدہ اخلاق اور نیک خصائل کا احترام کیا کرتے تھے اور عباد الرحمٰن کی اس اوّلین خصلت کو اہمیت دیتے تھے۔

مثبت اور منفی انکساری

البتہ حدود کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور یہ علم بھی ہونا چاہئے کہ ذلت اور انکساری کے درمیان بہت باریک فرق ہے۔ لہٰذا بہت سے افراد غلط فہمی کی بنا پر تواضع و انکساری کے نام پر ذلت کا گناہ کر بیٹھتے ہیں، جسے ہم منفی تواضع و انکساری کا نام دے سکتے ہیں۔ اس قسم کی منفی تواضع و انکساری سے اسلام شدت کے ساتھ روکتا ہے۔ قرآن کریم ممتاز بزرگ ہستیوں کی توصیف کرتے ہوئے فرماتا ہے: **اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ** (یہ لوگ مومنین سے نرمی برتتے ہیں اور کفار کے مقابل سخت ہوتے ہیں۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۵۴)

اس آیت میں واضح ہدایت موجود ہے کہ کفار اور سرکش و نافرمان افراد کے مقابل عاجزی و انکساری کا اظہار درست نہیں۔

اسی بنیاد پر امیر المومنین نے فرمایا ہے: **من اتی غنیاً فتضعضع له لشیٔ یصیبه منه ذهب ثلثا دینه** (ایسا شخص جو مال دنیا میں سے کسی چیز کے حصول کی غرض سے کسی دولت مند کے پاس آئے اور اسکے آگے خود کو حقارت سے پیش کرے، تو اسکا دو تہائی دین ختم ہو جاتا ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۴۳۔ از علامہ مجلسی)

نیز آپ ہی نے فرمایا ہے: **ما احسن تواضع الاغنیاء للفقراء طلباً لما عند الله، واحسن منه تیه الفقراء علی الاغنیاء اتکالاً علی الله.** (کس قدر اچھی بات ہے کہ مالدار لوگ اجر الٰہی کی خاطر فقرا کے ساتھ تواضع و انکساری سے پیش آئیں، لیکن اس سے بھی اچھی بات فقرا کا خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے دولت مندوں کے ساتھ وقار اور بے اعتنائی سے پیش آنا ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۴۰۶)

ہم انکساری اور عاجزی کے موضوع پر اپنی گفتگو کو اس دلچسپ اور سبق آموز داستان پر ختم کرتے ہیں: جنگِ احد میں پیغمبر اسلام کے ایک صحابی "ابو دجانہ انصاری" نے اپنے سر پر ایک شاندار عمامہ باندھا، اس کے کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنے کاندھے پر ڈالا اور انتہائی فخر و ناز کے ساتھ ایک عجیب پرشکوہ انداز میں چلتے ہوئے دشمن کے سامنے گئے (عام حالات میں اس طرح چلنا ایک طرح کا غرور اور تکبر ہوتا) پیغمبر اسلام نے جب انہیں اس انداز سے چلتے دیکھا تو فرمایا: **انّ هذه لمشیة یبغضها الله عزّوجلّ الاّ عند القتال فی سبیل الله** (اس طرح چلنے پر خدا ناراض اور غضبناک ہوتا ہے، مگر راہِ خدا میں معرکہ آرائی کے دوران یہ عمل (اسلامی قدرت و ہیبت کے اظہار اور دشمن کو خوفزدہ کرنے کی خاطر) پسندیدہ عمل ہے"۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱۔ ص ۹)

ان روایات سے یہ بات واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ تواضع اور عاجزی و انکساری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مثبت اور دوسری منفی۔ اسی طرح اسکی ضد تکبر بھی کبھی کبھی مثبت اور پسندیدہ ہو جاتا ہے۔

حلم اور ضبطِ نفس

قرآن مجید' خداوند عالم کے ممتاز بندوں کی دوسری خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے کہ: وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (اور جب جاہل ان سے (نامناسب انداز سے) خطاب کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کے جواب میں انہیں سلامتی کا پیغام دیتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۶۳) یعنی ان کے سامنے سے' بے اعتنائی اور بزرگواری کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں تحمل بردباری کی صفت پائی جاتی ہے اور انہیں اپنے اعصاب اور جذبات و احساسات پر قابو ہوتا ہے۔

ان لوگوں کا وصف یہ ہے کہ نامعقول افراد کے رویے کے مقابل بردباری اور ضبطِ نفس سے کام لیتے ہوئے' اسلامی اخلاق کی حدوں سے باہر نہیں نکلتے۔ عظمتِ کردار اور بزرگواری کی بدولت غیظ و غضب سے مغلوب نہیں ہو جاتے۔ ان کے مضبوط ارادے' ان کے صبر و تحمل اور سکون و اطمینان کی بنا پر انہیں پہاڑ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

یہ کہنا کوئی فخر کی بات نہیں کہ فلاں نے مجھ پر اعتراض کیا' مجھے برا بھلا کہا' تو اسکے جواب میں' میں نے اسے دس گنا زیادہ سنا ڈالیں۔ بلکہ قرآنِ کریم کی رو سے فخر و افتخار کی بات یہ ہے کہ ہم نامعقول لوگوں کے نامناسب رویے کے جواب میں ان کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیں۔ یعنی لڑائی جھگڑے سے پرہیز کریں اور درگزر سے کام لیتے ہوئے ان کی طرف سے منہ پھیر لیں۔

البتہ جس سلام کا یہاں (آیت میں) ذکر ہو رہا ہے وہ دوستی والا اسلام نہیں، بلکہ بے اعتنائی والا اسلام ہے، ایک طرح کے اعتراض اور ناراضگی کا اظہار ہے، جس میں تعلق برقرار رکھتے ہوئے صلح وصفائی کے ساتھ مل جل کر رہنے کا پیغام موجود ہے۔

ممکن ہے اس مقام پر یہ سوال پیش آئے کہ قرآن کریم اور روایاتِ معصومین میں متعدد مقامات پر مخالفین کو برابری سے جواب دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ ان ناشائستہ لوگوں کی گستاخی کا سدباب ہوسکے۔ مثلاً قرآن مجید فرماتا ہے: فَمَنِ اعْتَدىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدىٰ عَلَيْكُمْ (لہٰذا جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اسکے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسی زیادتی اس نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۹۴)

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نامناسب طرزِ عمل اپنانے والے ناشائستہ لوگوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں: پہلی قسم کے لوگ وہ بدخواہ دشمن ہوتے ہیں جو جانتے بوجھتے، بلکہ منصوبہ بندی کے ساتھ، نامناسب طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اسی انداز سے جواب دینا چاہئے۔ جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو لاعلمی میں ایسا طرزِ عمل اپناتے ہیں اور ان سے ایسی گفتار و حرکات جہل اور نادانی کی بنا پر سرزد ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ حلم و بردباری اور نرمی و ملائمت کا سلوک کرنا چاہئے۔

زیر بحث آیت میں اسی ثانی الذکر گروہ کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کی گئی ہے۔ لہٰذا حلم و بردباری کا اظہار اپنے صحیح مقام پر، یعنی جہاں اسے ملحوظ رکھنا چاہئے، نہ صرف تخریبی اور نقصاندہ نہیں بلکہ تعمیری اور موثر بھی ہے۔

مذکورہ آیت میں جن لوگوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے ان کے بارے میں رسول کریم نے فرمایا ہے کہ: اَحْلَمُ النّاس مَن فَرَّ مِن جُهّال النّاس (لوگوں میں سب سے زیادہ بردبار شخص وہ ہے جو جاہل انسانوں سے دور بھاگے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۱۲)

قرآنِ مجید کی رو سے حلم اور غصہ ضبط کرنے کا مفہوم

قرآنِ مجید میں حلم اور کظم غیظ (یعنی غصہ پی جانے) کا ذکر دو عمدہ اور عالی صفات

کے طور پر کیا گیا ہے۔ ان دونوں صفات کی بازگشت ایک ہی مفہوم کی جانب ہوتی ہے اور وہ ہے اپنے اعصاب پر کنٹرول ہونا، جذبات و احساسات کو قابو میں رکھنا، ضبطِ نفس کا مالک ہونا۔

کہا جاسکتا ہے کہ حلم اس حالت کو کہتے ہیں جو کظم غیظ یعنی غیظ و غضب کو ضبط کرلینے کا موجب بنتی ہے۔ بالفاظِ دیگر حلم کی واضح بلکہ بہترین مثال کظم غیظ ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: خیر الحلم التحلّم (بہترین حلم غصہ پی جانا ہے۔ غرر الحکم، نقل از میزان الحکمۃ۔ ج ۲۔ ص ۵۱۳)

قرآنِ مجید میں حلم کا لفظ "حلیم" کی تعبیر کے ساتھ پندرہ مرتبہ آیا ہے۔ ان میں سے گیارہ مرتبہ خداوندِ عالم کی ایک صفت کے طور پر اسکا ذکر ہوا ہے۔ (۱) جبکہ چار مرتبہ اسکا ذکر حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت اسماعیل اور حضرت شعیب کی ایک صفت کے عنوان سے ہوا ہے۔ (۲)

قرآنِ مجید میں کظم غیظ کو پرہیز گار بندوں کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربّ العزت ہے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ (وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنا غصہ پی جاتے ہیں۔ سورۂ آل عمران ۳- آیت ۱۳۴)

حلم کے معنی اپنے شدید غیظ و غضب پر قابو پالینا ہے۔ لغتِ قرآن کے معروف عالم "راغب اصفہانی" اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں لکھتے ہیں کہ: الحلم ضبط النفس عن هيجان الغضب (غیظ و غضب کے ہیجان کے موقع پر ضبطِ نفس کو حلم کہا جاتا ہے) مزید کہتے ہیں کہ: کیونکہ یہ حالت عقل اور خرد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اسی لئے کبھی کبھی حلم کے معنی عقل اور خرد بھی لئے جاتے ہیں۔ (مفردات راغب، لفظ حلم کے ذیل میں)

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیات ۲۲۵، ۲۳۵، ۲۶۳، سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۵۵، سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۲، سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۱۰۱، سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۵۹، سورۂ تغابن ۶۴۔ آیت ۱۷، سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۴۴، سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۵۱، سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۴۱۔

۲۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۱۴، سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۸۷، سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۷۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: **العقل خلیل المرء ، والحلم وزیرہ** (عقل انسان کی مخلص دوست ہے اور حلم عقل کا وزیر ہے)

آپ ہی کا ارشاد ہے: **الحلم نور جوھرہ العقل** (حلم ایک ایسا نور ہے جسکی حقیقت عقل و خرد ہے۔ غرر الحکم، نقل از میزان الحکمۃ۔ ج ۳۔ ص ۵۱۳، ۵۱۴)

دوسری احادیث میں بھی حلم کی صفت کا ذکر انہی معنی میں ہوا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے امام حسن علیہ السلام سے پوچھا: حلم کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: **کظم الغیظ وملک النفس** (غصہ پی جانا اور نفس پر قابو ہونا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۱۰۲)

نیز امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: **لاحلم کالصبر والصمت** (کوئی حلم صبر و استقامت اور زبان کی حفاظت کی مانند نہیں)

لفظ حلم کا استعمال امور و معاملات میں ثابت قدمی اور استقامت کے معنی میں بھی کیا گیا ہے۔ (بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۷۸، سفینۃ البحار لفظ "حلم" کے ضمن میں)

ان لغوی معنی اور ائمہ معصومین کی تشریحات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ حلم سے مراد ضبطِ نفس، انقلابی صبر اور امور و معاملات کے دوران ثابت قدمی ہے۔

اس مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو ضبطِ نفس میں زبان پر کنٹرول، اعصاب اور تمام اعضاء و جوارح پر تسلط شامل ہے۔ لہٰذا لفظ "حلم" کا ترجمہ "برداشت" جو ہمارے یہاں معروف ہو گیا ہے درست نہیں ہے۔ کیونکہ "سختی برداشت کرنا" حلم کے مطلق معنی نہیں ہیں۔ اسلئے کہ بسا اوقات اسکا مفہوم ظلم کے سامنے خاموشی سے گھٹنے ٹیک دینا اور اسے قبول کرنا ہوتے ہیں اور یہ عمل کوئی فضیلت نہیں رکھتا۔

اسی بنیاد پر حلم اور ظلم سہنے کے درمیان انتہائی کم فاصلہ پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے مقامات کی اچھی طرح شناخت لازم ہے تا کہ ظلم سہنے کو حلم نہ کہا جانے لگے اور انسان با فضیلت عمل کی انجماد ہی کی بجائے فضائل و اقدار کے مخالف کسی عمل کا مرتکب نہ ہو۔

کظم اور **غیظ** کے الفاظ میں لفظ "غیظ" کے لغوی معنی شدید غصہ اور غیر معمولی روحی

ہیجان اور اشتعال ہیں۔ اور اسکی وجہ روحانی اذیت یا گزند پہنچنا ہوتی ہے۔

لغت میں "**کظم**" کے معنی ہیں پانی سے بھری ہوئی مشک کا منہ بند کرنا۔ کنایتاً یہ لفظ ایسے افراد کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جو شدید غیظ و غضب سے بھرے ہوئے اور غصے کی شدت سے پھٹ پڑنے کے نزدیک ہوتے ہیں اور ان سے کوئی شدید ردِ عمل ظاہر ہوا چاہتا ہے۔ لیکن ان میں پایا جانے والا اضبط نفس مضبوط تسمے کی مانند غصے سے بھری ان کی مشک کا منہ بند کر دیتا ہے اور انہیں پھٹ پڑنے سے باز رکھتا ہے۔ لہٰذا **کظم غیظ** اور غصے کا ضبط کر لینا، حلم کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے، جو غصے سے پھٹ پڑنے اور بے جا تندی کے سد باب کا موجب ہے اور انسان کو نامعقول تندی اور ضرر رساں اور کبھی کبھی خطرناک ثابت ہونے والے جوش و خروش سے نجات دیتا ہے۔

البتہ اس جانب بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ اگر حلم اور **کظم غیظ** گناہگار اور مجرم شخص کی جرأت و جسارت کی وجہ بنے یا دوسرے مذموم نتائج کا سبب بن جائے تو بے جا اور منفی ہو جاتا ہے۔ مثلاً پیشہ ور مجرموں کے مقابل حلم کا اظہار اور غصے کو پی جانا، یا ایسے منافقین، کفار اور بے دین افراد سے رعایت اور ان سے چشم پوشی درست نہیں جو اسلام و مسلمین کو نقصان پہنچانے یا معاشرے میں فساد برپا کرنے میں مشغول ہوں۔

قرآنِ کریم کی نظر میں ضبطِ نفس کی اہمیت

زیر بحث آیت کے علاوہ بھی قرآنِ کریم میں اور کئی آیات ہیں جن میں حلم، ضبطِ نفس، متانت اور بردباری کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً: **اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ** (تم برائی کا جواب اچھے طریقے سے دو، اس طرح وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ بھی ایسا ہو جائے گا جیسے تمہارا مخلص دوست ہو۔ سورہ فصلت ۴۱۔ آیت ۳۴)

یہ آیت حلم اور ضبطِ نفس کے ایک خوبصورت اثر کی جانب اشارہ کر رہی ہے اور اس بات کی تلقین پر مشتمل ہے کہ دوسروں کی ناگوار اور رنجیدہ کر دینے والی باتوں کے جواب میں حسنِ

سلوک، اظہار محبت اور اچھے ردِ عمل کے ذریعے اپنی زندگی کو آرام دہ اور آسودہ رکھے۔ کیونکہ جب آپ اس انداز سے جواب دیں گے تو دشمنیاں اور عداوتیں، دوستی اور محبت میں بدل جائیں گی فتنہ و فساد کی آگ کے بھڑکتے شعلے سرد پڑ جائیں گے اور معاشرے میں یکجہتی، مہر و محبت اور برادری کا چلن عام ہوگا۔

علی ابن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ: خداوند عالم نے اسی آیت پر اپنے پیغمبر کی تربیت فرمائی، اور لوگوں کے ساتھ پیغمبر اسلام کے طرزِ عمل اور سلوک و برتاؤ کی بنیاد یہی حکم تھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد ''حفص'' سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: تم پر لازم ہے کہ تمام امور میں صبر و تحمل اور متانت و بردباری کا مظاہرہ کرو۔ یہ بات ذہن نشین رکھو کہ خداوند عالم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسالت کے لئے منتخب کیا اور انہیں صبر و تحمل کی ہدایت کی (اسکے بعد حضرت نے مذکورہ آیت کی تلاوت کی) اور فرمایا: پیغمبر نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور اسکے ذریعے بلند اور عظیم الشان مقاصد و نتائج حاصل کئے۔

شیخ صدوق علیہ الرحمہ کی ''امالی'' میں روایت ہے کہ: ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں صلۂ رحم کرتا ہوں لیکن وہ قطع رحم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے اسکے جواب میں مذکورہ بالا آیت پڑھی اور اسے ہدایت کی کہ وہ بردباری، صبر اور تحمل کے ساتھ (ان کی) بدسلوکی کا نیکی سے جواب دے۔

اس شخص نے صبر و تحمل اور لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے بارے میں کچھ اشعار پڑھے، پیغمبر اسلام نے اسکے اشعار کی تعریف کی اور فرمایا: بعض اشعار حکمت پر مشتمل ہوتے ہیں اور بعض اپنے بیانات میں جادوئی اثر رکھتے ہیں۔ (اقتباس از تفسیر نور الثقلین۔ ج ۴۔ ص ۵۴۹، ۵۵۰)

جیسا کہ ذکر ہوا، قرآن کریم میں پندرہ مقامات پر اللہ رب العزت کو ''حلیم'' کی صفت سے یاد کیا گیا ہے۔ پس یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو لوگ (صحیح اور کامل طور پر) اس صفت کے

حامل ہیں وہ خدا کی اس صفت کے مظہر ہیں۔ اور یہ بات حلم اور ضبطِ نفس کی انتہائی اہمیت کی علامت ہے۔

خداوند عالم نے قرآن مجید میں اپنے عظیم المرتبت پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس وجہ سے تعریف و تمجید کی کہ وہ ''حلم'' جیسی عالی صفت کے حامل تھے، اور فرمایا ہے کہ: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (بے شک ابراہیم بہت ہی حلیم اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۷۵) اور حضرت ابراہیم کو ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں بشارت دیتے ہوئے فرمایا: فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (پھر ہم نے انہیں ایک حلیم فرزند کی بشارت دی۔ سورہ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۱)

یہاں سبق آموز نکتہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل اور بھی دوسرے عالی فضائل اور انسانی خصائل کے مالک تھے، لیکن اسکے باوجود ان دونوں آیات میں صرف ان کی صفت ''حلم'' کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک اور آیت میں پیغمبر اسلام کو حلم اور ملائمت کی ہدایت کی گئی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۵۹)

پیغمبر اسلام اور ائمۂ معصومین کے گفتار و کردار میں حلم کی اہمیت

پیغمبر اسلام اور ائمۂ معصومین نے جابجا اپنے کردار اور اقوال کے ذریعے تلخ و ناگوار حوادث کے مقابل حلم اور ضبطِ نفس کی تاکید اور تلقین کی ہے۔ اس بارے میں چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: كمال العلم الحلم، و كمال الحلم كثرة الاحتمال والكظم (حلم کمالِ علم ہے اور کمالِ حلم، کثرت سے تحمل اور بکثرت غصے کو ضبط کرنا ہے۔ غرر الحکم، نقل از میزان الحکمۃ۔ ج ۲۔ ص ۵۱۶)

آپ ہی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ: جمال الرجل حلمه، انک مقوّم بادبک فزیّنه

بالحلم (انسان کی زیبائی' اسکا حلم ہے۔ اے انسان! تو اپنے موہوب ہونے سے پرکھا جاتا ہے' تیری زینت حلم کے ذریعے فراہم ہوتی ہے۔ حوالۂ سابق۔ ص ۵۱۳)

آپ ہی کا ارشاد ہے: الحلم یطفی نار الغضب و الحدّة تؤ جج احراقه (حلم' غصے کی آگ کو بجھاتا ہے لیکن تندی اور گرم مزاجی' اس آگ کے شعلوں کو بھڑکاتی ہے۔ حوالۂ سابق۔ ص ۵۱۸)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: الحلم سراج الله (حلم وضبطِ نفس خداوند عالم کا روشن چراغ ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۴۲۲)

یہاں ہم نے اس موضوع پر موجود سیکڑوں احادیث میں سے صرف چند احادیث بطور مثال پیش کی ہیں۔ ان میں سے ہر حدیث میں مختلف تعبیروں کے ذریعے "حلم" کی صفت کو سراہا گیا ہے اور تحمل اور ضبطِ نفس کی خصوصیت کے حامل انسان کی تعریف کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام' ائمہ معصومین' اولیائے الٰہی اور علمائے ربانی کی زندگیوں میں یہ بات کثرت کے ساتھ نظر آتی ہے کہ وہ اپنے مہر و محبت آمیز طرزِ عمل کے ذریعے صفت حلم کا مظاہرہ کرتے تھے۔

انس بن مالک کہتے ہیں: میں پیغمبر اسلام کی خدمت اقدس میں موجود تھا۔ آپ کے کاندھوں پر ایک ایسی عبا پڑی ہوئی تھی جس کے کنارے سخت تھے۔ اسی اثنا میں ایک بدوعرب آنحضرت کے نزدیک آیا اور آپ کی اس عبا کو پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ اس کے کناروں نے آنحضرت کی گردن زخمی کردی۔ پھر اسکے بعد گستاخی سے بولا: اے محمد! تمہارے پاس اللہ کا جو مال ہے اسے میرے ان اونٹوں پر لاد دو' تاکہ میں اسے لے جاؤں کیونکہ یہ نہ تو تمہارا مال ہے نہ تمہارے والد کا۔

آنحضرت نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا: یہ مال' خدا کا مال ہے اور میں خدا کا بندہ ہوں۔

پھر مزید فرمایا: اے اعرابی! جو زخم تم نے مجھے لگایا ہے' کیا ویسا ہی زخم میں تمہیں لگاؤں؟

اس بدو نے جواب دیا: نہیں۔

آنحضرت نے فرمایا: کیوں؟

اس نے کہا: کیونکہ آپ برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتے۔ بلکہ اسے اچھے انداز سے دور کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام اسکی یہ بات سن کر مسکرائے اور پھر اسکے ایک اونٹ کو جو سے اور دوسرے کو کھجوروں سے لاد کر اسکے حوالے کردینے کا حکم دیا۔ (کحل البصر۔ ص ۱۴۵)

فتح مکہ کے موقع پر بہت سے مشرکین کو سپاہِ اسلام نے قیدی بنالیا۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ آنحضرت انہیں قتل کردیں گے اور ان کے مال واسباب کو تباہ و برباد کردیں گے۔ اسی اثنا میں لشکر اسلام کے ایک پرچمدار "سعد" کی صدا بلند ہوئی: الیوم یوم الملحمة' الیوم تسبی الحرمة' الیوم اذلّ الله قریشا (آج انتقام کا دن ہے' آج دشمنوں کے مال واسباب عزت و آبرو کی بربادی کا دن ہے' آج قریش کی ذلت وخواری کا دن ہے)

آنحضرت نے جب یہ نعرہ سنا تو اسے ایک محبت آمیز نعرے سے بدل دیا اور فرمایا: الیوم یوم المرحمة' الیوم اعزّ قریشاً (آج رحمت کا دن ہے' آج قریش کی عزت کا دن ہے) اور پھر آپ نے حضرت علی سے فرمایا: پرچم ہاتھ میں لو اور مکہ میں داخل ہو جاؤ۔

اسکے بعد پیغمبر اسلام نے قریش کو مخاطب کرکے فرمایا: اذهبوا فانتم الطلقاء (جاؤ' تم سب آزاد ہو۔ اقتباس از بحار الانوار۔ ج ۲۱۔ ص ۱۰۹ اور ۱۰۵)

ایک دوسری روایت کے مطابق پیغمبر اسلام نے ان لوگوں سے فرمایا: تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ ان لوگوں نے عرض کیا: ہم آپ سے اچھے طرزِ عمل کی توقع رکھتے ہیں' آپ ہمارے کرم پرور بھائی اور ہمارے کریم النفس بھائی کے فرزند ہیں۔ پیغمبر اسلام نے انہیں مخاطب کرکے فرمایا: میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ: "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ" (آج تم پر کوئی عتاب نہ ہوگا۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۹۲)۔ جاؤ تم آزاد ہو۔ (کحل البصر۔ ص ۱۴۶)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حیات کے تذکرے میں آیا ہے: آپ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک روز لوگوں سے فرمایا: جو سوال تمہارے ذہن میں ہو مجھ سے پوچھ لو۔ زیر

آسمان چیزوں کے متعلق ہر سوال کا جواب میں تمہیں دوں گا اور میرے بعد یہ دعویٰ سوائے جھوٹے اور دروغ گو کے کوئی اور نہیں کرے گا۔

اس موقع پر مجلس کے ایک گوشے سے ایک بلند قامت شخص اٹھا۔ اسکی گردن میں ایک کتاب لٹک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی یہودی عرب ہے۔ وہ بلند آواز میں انتہائی گستاخی کے ساتھ حضرت علی کو مخاطب کر کے بولا: اے اس چیز کے دعوے دار جسے تم نہیں جانتے اور بے جا حد سے تجاوز کرنے والے انسان! میں تم سے ایسے سوالات کروں گا جن کے جواب تم نہ دے سکو گے۔

اس شخص کی یہ گستاخی دیکھ کر حضرت علی کے اصحاب اور شیعوں میں سے کچھ لوگ اسے سبق سکھانے کے لئے اٹھے۔ یہ دیکھ کر امیر المومنین نے سختی کے ساتھ ان لوگوں کو اس عمل سے روکا اور فرمایا: اسے کہنے دو' جلد بازی' تیز مزاجی اور غصے کو خود سے دور رکھو' ان اعمال سے بندگانِ خدا پر خدا کی حجتیں تمام نہیں ہوتیں اور براہینِ الٰہی آشکار نہیں ہوتے۔

اسکے بعد آپ نے انتہائی تحمل اور بزرگواری کے ساتھ اس شخص کی طرف رخ کیا اور فرمایا: جو سوال تمہارے ذہن میں ہے اسے پوچھو۔ اس شخص نے اپنے سوال پیش کئے اور حضرت نے اسکے تمام سوالوں کے جواب دیئے۔

یہ طرزِ عمل دیکھ کر اور سوالات کے تسلی بخش جواب پا کر وہ شخص حضرت علی کے حلم اور علم کا شیفتہ ہو گیا اور آپ کی مدح میں چند اشعار پڑھے اور امیر المومنین کو صاحبِ علم' گمراہوں کے راہبر' اور کمال و انسانی فضائل میں جوانمرد قرار دیا۔ (بحار الانوار۔ ج ۴۱۔ ص ۴۲۴)

اسی طرح ایک اور موقع پر آپ کی حیاتِ مبارکہ میں تحریر ہے کہ ایک دن ایک شخص نے آپ کی موجودگی میں آپ کے غلام قنبر کو سخت و سست کہا۔ جب قنبر نے بھی اسے دو بدو جواب دینا چاہا تو امیر المومنین نے انہیں صدا دی اور فرمایا: مهلاً يا قنبر' دع شاتمک ... (اے قنبر آرام سے رہو' دشنام دینے والے کو اپنی بے اعتنائی سے بخش دو' تا کہ اپنے پروردگار کو خوش' شیطان کو غضبناک اور اپنے دشمن کو عذاب میں مبتلا کرو (کیونکہ بے اعتنائی سے بڑھ کر اسکے لئے کوئی عذاب

نہیں) اس خدا کی قسم' جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور انسانوں کو خلق کیا ہے' مومن اپنے پروردگار کو جس قدر "حلم" سے خوش کرتا ہے کسی اور چیز سے خوش نہیں کرتا اور جتنا حلم اور ضبطِ نفس سے شیطان کو غضبناک کرتا ہے اتنا کسی اور چیز سے اسے غضبناک نہیں کرتا۔ احمق اور نادان کو جتنا عذاب سکوت اور خاموشی سے پہنچتا ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں پہنچتا۔ (بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۴۲۴)

اس بیان میں حضرت علی کا قسم کھانا' حلم کی غیر معمولی اہمیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

دوسرے تمام ائمہ کی زندگیوں میں بھی کثرت کے ساتھ اس قسم کا بزرگوارانہ طرزِ عمل نظر آتا ہے۔ اسی طرح ان کے اصحاب' شاگردوں اور علمائے ربانی کے یہاں بھی یہ روش بکثرت دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر ہم اسکی مثالوں کے ذکر سے گریز کر رہے ہیں۔

امیر المومنین پرہیزگاروں کی توصیف میں فرماتے ہیں: فحلماء علماء (یہ لوگ حلیم اور دانا ہوتے ہیں)

نیز فرماتے ہیں: يمزج الحلم بالعلم (ان کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے حلم کو علم کے ساتھ ملا دیا ہے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۳)

حضرت علی کے ایک بہترین شاگرد اور آپ کی سپاہ کے بے مثل سردار' مالک اشتر' ایک دن بازارِ کوفہ سے گزر رہے تھے۔ ایک شخص جو ان سے واقف نہ تھا اس نے کچھ کچرا اٹھا کر ان پر پھینک دیا اور اپنی اس حرکت پر ہنسنے لگا۔ مالک اشتر اس سے کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئے۔ ایک دکاندار یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مالک اشتر کے چلے جانے کے بعد اس نے اس احمق شخص سے کہا: تجھے معلوم ہے یہ محترم ہستی کون تھی؟ یہ حضرت علی کی سپاہ کے جری سردار مالک اشتر تھے۔ یہ سن کر وہ شخص معذرت کی غرض سے ڈرتا کانپتا مالک اشتر کے پیچھے دوڑا اور اس نے دیکھا کہ مالک اشتر مسجد میں نماز میں مشغول ہیں۔ جب انہوں نے نماز تمام کر لی تو وہ شخص ان کے پاس گیا اور معذرت طلب کرنے لگا۔ مالک اشتر نے کہا: بخدا میں اس وقت خداوند عالم سے تیرے لئے بخشش طلب کرنے کی غرض سے ہی مسجد آیا ہوں۔ تا کہ خدا تیرے اخلاق کی اصلاح فرمائے اور تجھے بخش دے۔ (بحار الانوار۔ ج ۴۲۔ ص ۱۵۷)

حلم اور ضبطِ نفس کے مثبت اثرات

حلم کی ایک برکت اور اثر عفو و درگزر ہے۔ عفو و درگزر جوانمردوں کی صفات میں سے ہے جس کے ذریعے دوستی کے تعلقات اور باہمی روابط میں استحکام اور مہر و محبت پیدا ہوتی ہے۔

ایسا انسان جس میں حلم کی صفت نہ ہو اس میں عفو و درگزر کی خصوصیت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم کا حلیم ہونا اسکی جانب سے عفو و بخشش کا موجب ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ایک خطبے کے آغاز میں فرماتے ہیں: **الحمد لله ..... الذی عظم حلمه فعفا** (اس خدا کی حمد و سپاس جس کے حلم کی عظمت اسکے عفو و درگزر کا موجب ہے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۱)

حلم کی ایک اور تاثیر یعنی اسکی وجہ سے دوستوں میں اضافہ ہونے کے بارے میں امیر المومنین فرماتے ہیں: **وبالحلم عن السفیه تکثر الانصار** (احمق لوگوں کے مقابل حلم و بردباری کا اظہار انسان کے ساتھیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۲۲۴)

اسی بنیاد پر آپ نے فرمایا ہے کہ: **الحلم عشیره** (حلم خود ایک قبیلے کی مانند ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار۔ ۴۱۸)

حلم سے ہمت پیدا ہوتی ہے اور یہ انسان کی عزت و آبرو کی حفاظت کا موجب ہوتا ہے۔ حلم کی اس تاثیر کے بارے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: **والحلم والاناة توامان ینتجهما علوّ الهمّة** (حلم اور بے اعتنائی دو جڑواں مولود ہیں جن سے بلند ہمتی پیدا ہوتی ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۴۶۰)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا: **الحلم غطاء ساتر** (حلم ڈھانکنے والا پردہ ہے)

حلم کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ یہ عزت و شرف کا باعث ہے۔ لہٰذا حضرت علی نے فرمایا ہے: **ولا عز کالحلم** (کوئی شرف حلم کی مانند نہیں۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۱۱۳) یعنی حلم اور ضبط نفس خداوند عالم کی بارگاہ اور لوگوں کی نظروں میں عزت و شرف کا باعث ہے۔

حلم ہی کے اثرات اور برکات میں سے ایک یہ ہے کہ کاموں میں تقصیر اور کوتاہی کا موجب

ہوتا اور لوگوں کے سامنے ایک پسندیدہ اور خوشگوار زندگی کا باعث بن جاتا ہے۔ بقول امام علی علیہ السلام: **ومن حلم لم یفرط فی امره، وعاش فی الناس حمیداً** (حلیم شخص اپنے کاموں میں تفریط و کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوتا اور لوگوں کے درمیان پسندیدہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۳۱)

خداوند عالم سے دعا گو ہیں کہ ہم ان فرامین اور بزرگانِ دین کے اس طرزِ عمل سے حلم اور ضبطِ نفس کا درس لیں اور اس خصلت کے ذریعے دنیا اور آخرت میں امتیازی مقام حاصل کریں۔

عبادتِ الٰہی میں خلوص و معرفت

قرآنِ مجید میں' خدا کے خاص اور ممتاز بندوں کی تیسری خصوصیت اور امتیاز کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا (خدائے رحمان کے خاص بندے وہ لوگ ہیں جو اپنی راتیں پروردگار کے لئے سجدے اور قیام کی حالت میں بسر کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۴)

یعنی یہ لوگ خدا سے انتہائی قریبی اور مضبوط عبادی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی گہرے تعلق کا نتیجہ ہے کہ وہ راتوں کو اپنے نرم اور گرم بستر چھوڑ کر خدا کی عبادت اور اس سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے ہیں' اور سجود و قیام کے ذریعے' اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے سامنے عاجزی اور انتہائی بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ بندگانِ خالص خالقِ کائنات کی مخلصانہ عبادت کے ذریعے اپنی روح کو جلا اور صفا بخشتے ہیں' تعلق باللہ سے پھوٹنے والے صاف و شفاف چشمے کے پانی سے اپنا قلب دھوتے' چمکاتے اور نورانی کرتے ہیں۔

جس وقت غفلت شعار لوگ گہری' میٹھی نیند سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں' اور ایک ایسے وقت جب ریا اور خودنمائی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی' اس وقت خدا کے یہ مخلص بندے اپنی میٹھی

نیند چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ لذت آور شئے یعنی خدا کے ذکر اور اسکی عظیم بارگاہ میں قیام و سجود میں مشغول ہو جاتے ہیں خدا کے ساتھ اپنے روحانی اور عرفانی بندھن کو مضبوط و مستحکم کرتے ہیں توحید کے بے کنار سمندر میں غوطہ ور ہو کے یکتا پرستی کے جام سے مست ہو کر اپنے قلب کو عشقِ حقیقی سے آشنا کرتے ہیں اور اپنی روح کی تشنگی اور پاکیزہ اور تشنۂ توحید فطرت کو چشمۂ توحید سے سیراب کرتے ہیں۔

عبادت اور اسکا فلسفہ

قرآن مجید میں خدا کی عبادت اور عبادی رسومات جیسے نماز روزے حج اور دعا وغیرہ کے بارے میں خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اور دوسری ہر چیز سے پہلے عبادت کو خدا کے خاص بندوں اور ممتاز انسانوں کی اصل اور بنیادی خصوصیات میں سے قرار دیا گیا ہے۔ یہ پاکیزہ صفات افراد عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے تمام اعمال کو بھی بندگیٔ رب کے طور پر انجام دیتے ہیں اور اپنی تمام سرگرمیوں کو خالص نیت اور ہر قسم کی آلائشوں اور غلاظتوں سے پاک کر کے الٰہی رنگ دیتے اور عبادت کے صاف و شفاف پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔

عبادت کا لفظ دراصل لفظ "عبد" سے لیا گیا ہے اور عبدِ کامل اس انسان کو کہا جاتا ہے جو اپنے مولا اور مالک کا سراپا اطاعت گزار اور تابعدار ہو اسکا ارادہ اپنے آقا و مالک کا تابع ہو اسکی خواہشات اپنے حاکم اور مولا کی تابع ہوں۔ (وہ انسان جو خدا کی بندگی اور عبودیت کا دعویدار ہوتا ہے) خدا کے سامنے اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتا اور اس کی اطاعت میں سستی اور کاہلی کو کسی صورت اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔

واضح الفاظ میں عرض کریں کہ اپنے بندے کو نہایت انعام و اکرام سے نوازنے والے معبود یعنی خدائے یکتا اور بے ہمتا کے سامنے زندگی کے ہر شعبے اور ہر میدان میں حد درجہ خضوع اور انکساری کا اظہار "عبادت اور بندگی" کہلاتا ہے۔

عبودیت ذاتِ خدا کے سامنے انتہائی تسلیم اور تابعداری کا نام ہے۔ عبودیت ہر میدان میں خداوندِ عالم کی بے قید و شرط بلا چوں و چرا اطاعت و فرمانبرداری کا نام ہے۔

عبودیتِ کامل کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس حقیقی معبود اس کمالِ مطلق کے سوا کسی اور کو خاطر میں نہ لائے اسکی دکھائی ہوئی راہ کے سوا کسی اور راستے پر قدم نہ رکھے سوائے اسکے کسی اور کے ساتھ دل وابستہ نہ کرے اور سب سے کٹ کر صرف اسی کا ہو رہے۔ خدا کے ساتھ اسکی یہ وابستگی اس حد تک پہنچی ہوئی ہونی چاہئے جس کا ذکر مناجاتِ شعبانیہ میں آیا ہے جسے حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے تمام ائمہ تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس مناجات کے ایک حصے میں ہے کہ: **اِلٰهی هَبْ لی کَمالَ الاِنْقِطاعِ اِلَیْکَ، وَاَنِرْ اَبْصارَ قُلوبِنا بِضِیاءِ نَظَرِها اِلَیْکَ، حَتّی تَخْرِقَ اَبْصارُ الْقُلوبِ حُجُبَ النّورِ، فَتَصِلَ اِلی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ، وَتَصیرَ اَرْواحُنا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ** (بارالہا! مجھے اپنی مخلوقات سے کٹ جانے اور (تو) اپنی ذاتِ پاک سے جڑ جانے کا کمال بخش دے (خدایا مجھ کو اپنی جانب مکمل انقطاع عطا کر) اور میرے دل کی آنکھ کو اس نور سے روشن فرما جو تیرا مشاہدہ کر سکے تاکہ میری دیدۂ بصیرت نور کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی عظمت کے معدن تک جا پہنچے اور ہماری روحیں تیرے مقامِ قدس کی عزت سے وابستہ ہو جائیں۔ (مناجاتِ شعبانیہ از مفاتیح الجنان)

قرآن کریم میں خدا کی عبادت و بندگی کو ہدفِ خلقت اور انسانی کمال کی انتہائی بلندی قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری ہے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ** (ہم نے جن و انس کو صرف اس لئے خلق کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔ سورۂ ذاریات ۵۱۔ آیت ۵۶)

اس آیت کے مطابق انسان کی خلقت کا مقصد یہ ہے کہ وہ خلوص اور معرفت کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں اس طرح خدا کی عبادت کرے جیسا اسکی عبادت کا حق ہے۔

اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ خداوندِ عالم انسانوں کی عبادت کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تمام کائنات کافر ہو جائے اللہ سبحانہ تعالیٰ سے منہ موڑ لے تب بھی اللہ رب العزت کے دامنِ کبریائی پر کوئی معمولی سی بھی آنچ نہ آئے گی۔

بلکہ عبادت دراصل خود انسان کی تعمیرِ ذات بہبود اور تکمیل کے لئے ہے۔ انسان صحیح صحیح اور شرائط کے ساتھ انجام دی گئی عبادت کے ذریعے تربیت پاتا ہے اسکی شخصیت جِلا پاتی اور پاکیزہ

ہوتی ہے۔ وہ خدا کی بندگی کے برخلاف ہر قسم کے گناہ اور گمراہی سے دور رہتا ہے اور خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے اعلیٰ و ارفع روحانی فضیلتیں حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ قدم بقدم آگے بڑھتے ہوئے کمال کی چوٹی پر جا پہنچتا ہے۔

فلسفۂ عبادت کے بارے میں یہ آیت قرآن اسی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ:

"يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ." (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۱)

"اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، وہ جس نے تمہیں اور تم سے پہلے آنے والے لوگوں کو خلق کیا ہے، شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

اس آیت میں فلسفۂ عبادت کی وضاحت کی گئی ہے جو پرہیزگاری، پاکیزگی اور روح سے ہر قسم کی آلودگیوں کو دھوڈالنا ہے۔

لہٰذا عبادت کا ایک مقصد انسان کے گناہوں کو دھوڈالنا اور اسے پاک کرنا ہے۔ اس مرحلے کے بعد عبادت کے دوسرے مرحلے یعنی مرحلۂ تکامل کی نوبت آتی ہے، جس میں انسان تکامل کے درجات و مراحل طے کرتا ہے۔

قرآن کریم میں جس مقام پر خداوند عالم نے پیغمبر اسلام کی معراج کو بیان کیا ہے (معراج جو آنحضرت کی عظمت کی انتہائی بلندیوں کی علامت ہے) اسی مقام پر پیغمبر کی عبودیت کے معاملے پر بھی گفتگو فرمائی ہے اور وضاحت کی ہے کہ پیغمبر اسلام کے تکامل اور ان کی عظمت کی بلندیوں کی بنیاد آنحضرت کی بندگی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ."

"پاک و پاکیزہ ہے وہ (معبود) جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے، تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں، بے شک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ

دیکھنے والا ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۱)

شب معراج، پیغمبر اسلام کے سدرۃ المنتہیٰ پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے:

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (پھر خدا نے اپنے بندے (پیغمبر) پر جو وحی کرنی چاہی وہ وحی کر دی۔ سورۂ نجم ۵۳- آیت ۱۰)

یہ دو آیات، پیغمبر اسلام کی معراج اور آپ کی بندگی کے درمیان پائے جانے والے تعلق کو واضح کرتی ہیں۔ یعنی رسول کریم کا خدا کی عبودیت اور اسکی بندگی کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہونا معراج کی بلندیوں تک آپ کی رسائی اور تکامل کا موجب بنا۔

خود پیغمبر اسلام اور ائمۂ معصومین کے کلمات میں بھی مختلف طریقوں سے اس نکتے کو بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر روایت کی گئی ہے کہ معراج کے دوران ایک فرشتہ پیغمبر اسلام کے پاس آیا اور عرض کیا: خداوند عالم نے زمین کے تمام خزانوں کی چابیاں آپ کے حوالے کرنے کی غرض سے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو پیغمبر اور عبد رہیں اور اگر چاہیں تو پیغمبر اور بادشاہ بنیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسکو جواب دیا: بَلْ اَكُوْنُ نَبِيًّا عَبْدًا (میں پیغمبری اور عبودیت کو چنتا ہوں۔ بحار الانوار۔ ج ۱۸۔ ص ۳۸۲)

ائمۂ معصومین کے فرامین میں ملتا ہے: اِنَّ الصَّلَاةَ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ (بے شک نماز مومن کی معراج اور اسکے عروج و بلندی کا وسیلہ ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۸۲۔ ص ۳۰۳)

احادیث قدسی میں ایک مقام پر ہے: شب معراج خداوند عالم نے پیغمبر اسلام کو مخاطب کر کے فرمایا: عَبْدِيْ اَطِعْنِيْ اَجْعَلْكَ مَثَلِيْ اِذَا قُلْتَ لِشَيْءٍ كُنْ فَيَكُوْنُ (اے میرے بندے! میری اطاعت کر، تاکہ میں تجھے اپنا ایک ایسا مظہر بنادوں کہ جب تو کسی چیز کو کہے کہ ہو جا تو وہ چیز واقع ہو جائے)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: اَلْعُبُوْدِيَّةُ جَوْهَرَةٌ كُنْهُهَا الرُّبُوْبِيَّةُ (عبودیت اور بندگی وہ جوہر ہے جس میں ربوبیت پوشیدہ ہے۔ مصباح الشریعہ۔ باب ۱۰۰)

مراد یہ ہے کہ عبودیت اور بندگی' انسان کو خدا سے انتہائی قریب کر کے اسے مقامِ ربوبیت پر پہنچا دیتی ہے' اسے خدا کی صفات کا مظہر بنا دیتی ہے اور وہ اذنِ الٰہی سے عالمِ تکوین میں تدبیر و تصرف کرنے لگتا ہے' اس کے ہاتھوں کرامات اور غیر معمولی امور سرزد ہونے لگتے ہیں۔

اس بات کی وضاحت اس مثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے کہ اگر ٹھنڈے اور سیاہ لوہے کو لوہار کی بھٹی میں ڈال دیا جائے تو وہ پگھل کر سرخ انگارا بن جاتا ہے۔ یہ لوہا' لوہا ہونے کے ساتھ ساتھ' آگ کے نزدیک ہونے کی وجہ سے چمکتا ہوا انگارا سا محسوس ہوتا ہے۔ لوہے کی یہ حدت اور چمک اُس آگ کا معمولی سا اثر ہے جس میں وہ پڑا ہوتا ہے اور جو اسے اس رنگ میں لے آتی ہے۔ انسان بھی عبودیت کے اثر سے خدا کی طرح بن سکتا ہے۔ استاد شہید مرتضیٰ مطہری علیہ الرحمہ کے بقول بندے کو یہ سیر و مقام پانچ مراحل میں حاصل ہوتا ہے:

۱۔ بندگی کے سائے میں انسان اپنے نفس پر غلبہ اور کنٹرول حاصل کر لیتا ہے۔

۲۔ اس مرحلے کے بعد انسان اس قدر قوی بن جاتا ہے کہ اس کا نفس طاقتور ہو کر گناہوں کو اپنے آپ سے دور کرنے کی قوت پا لیتا ہے۔

۳۔ اس مرحلے کے بعد' بہت سے امور میں روح بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

۴۔ اس مرحلے کے بعد روح بدن کو چھوڑ دیتی ہے اور بدن ہر لحاظ سے روح کے کنٹرول میں آ جاتا ہے۔

۵۔ پانچویں مرحلے میں' انسان اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے کہ حتیٰ اپنے بدن سے باہر کی اشیا پر بھی اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ اولیائے الٰہی جن سے معجزے' کرامات اور عالمِ تکوین میں تصرف جو خداوند عالم سے مخصوص کاموں میں سے ہے' اس شخص سے بھی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ (ولا ھاد ولا۔ تھا۔ ص ۷۲ تا ۸۲' بطور اقتباس)

عارفانہ اور مخلصانہ عبادت

عبادت میں پایا جانے والا اخلوص اور معرفت' اس میں تاثیر پیدا کرتا ہے اور اسی کے سائے میں انسان کمال کی بلندیوں کو چھوتا ہے۔

اگر عبادت معرفت سے خالی ہو تو ایک بے جان جسم کی مانند ہے' بے سوچے سمجھے انجام دی جانے والی حرکات و سکنات اور ایک کھوکھلا عمل ہے۔ اسی طرح اگر عبادت شرک آلود ہو' دکھاوے کے لئے انجام دی جائے تو شرکِ خفی کا موجب بن کر خدا سے تقرب کی بجائے اس سے مزید دوری کا سبب بن جائے گی اور نتیجے کے طور پر بے سود رہے گی۔ اُس کھوکھلے پھل کی مانند جس میں نہ صرف کوئی مفید خاصیت نہیں پائی جاتی بلکہ نقصان دہ بھی ہو جاتا ہے۔

عارفانہ عبادت ایسی عبادت کو کہتے ہیں جسے انسان خدا کی معرفت اور شناخت کے ساتھ انجام دیتا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے خدا کی عبادت کرتا ہے کہ وہی لائقِ عبادت ہے اور اسکی عطا کردہ نعمتوں پر شکر کا تقاضا ہے کہ اسی کی پرستش کی جائے۔ ایسا ہی شخص عبادت کے مغز اور اسکے فلسفے کو جانتا ہے اور اسکی روح اور فکر میں عبادت کی حقیقت جڑ پکڑ چکی ہوتی ہے' رچ بس گئی ہوتی ہے' اور وہ اس بلند اور رفیع الشان سوچ کے ساتھ رہوارِ عبادت پر سوار ہو کر ملکوت کی جانب پرواز کرتا ہے۔

اس جانب متوجہ کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"بے شک ایک گروہ بہشت کی رغبت میں خدا کی عبادت کرتا ہے' یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ ایک دوسرا گروہ آتشِ جہنم کے خوف سے خدا کی پرستش کرتا ہے' یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ جبکہ ایک اور گروہ خدا کی نعمتوں کے شکر میں اسکی عبادت بجالاتا ہے' یہ آزاد منش افراد کی عبادت ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ کلماتِ قصار ۲۳۷)

امام کے اس قول سے ظاہر ہے کہ کامل اور عارفانہ عبادت' ایسی عبادت ہے جو صرف خدا کے لئے اور اسکی نعمتوں پر شکر کی غرض سے ہو۔

مخلصانہ عبادت' وہ عبادت ہے جو حضورِ قلب' اخلاص و صفا اور ہر قسم کے ریا اور خودنمائی سے پاک ہو۔ صرف اور صرف خدا کے لئے ہو۔ مثال کے طور پر پانی مایۂ حیات ہے۔ یہ خصوصیت صرف اسی پانی میں پائی جاتی ہے جو صاف و شفاف ہو جبکہ آلودہ پانی جس میں مختلف جراثیم کی آمیزش ہو' نہ صرف مایۂ حیات نہیں بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

ریا سے آلودہ اور غیر خالص عبادت' ایسے ہی آلودہ اور جراثیم بھرے پانی کی مانند ہے جبکہ مخلصانہ اور بے ریا عبادت' مثبت اور تعمیری آثار کی حامل اور انسان سازی اور انسانی کمال کا موجب ہوتی ہے۔

عباد الرحمٰن کی تیسری خصوصیت کو بیان کرنے والی زیر بحث آیت (یعنی سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۶۴) دو نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ خدا کے یہ مخلص بندے ہمیشہ خدا ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ عبادتِ الٰہی کے خوگر ہو کر مسلسل اسی میں مشغول رہتے ہیں اور متواتر قیام و سجود کے ذریعے اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ رات ڈھلے آرام دہ بستر چھوڑ کر خدا کی عبادت اور اس سے راز و نیاز میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

آیت میں ان بندگانِ خدا کے راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت کرنے کی جو بات بیان کی گئی ہے وہ ان کے اخلاص کو ظاہر کرنے کیلئے ہے۔ یعنی یہ لوگ تاریکیٔ شب میں' جب کسی بھی قسم کے دکھاوے اور ریا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی (یہ صورتِ حال عام طور پر رات کی تاریکی ہی میں پیدا ہوتی ہے) خدا سے راز و نیاز کرتے ہیں۔

حقیقی اخلاص یہ ہے کہ عمل کے ارادے اور اس کی انجام دہی کا سبب صرف اور صرف اللہ رب العزت ہو۔ مرحوم فیض کاشانی کے بقول: اخلاص یہ ہے کہ انسان کی نیت ہر قسم کے شرکِ خفی اور شرکِ جلی سے پاک ہو۔ اسکے بعد سورۂ نحل کی چھیاسٹھویں آیت کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ: خالص دودھ وہ ہوتا ہے جس میں نہ ہی خون کے ذرّات ہوں اور نہ ہی شکم کے اندر کی کسی غلاظت وغیرہ کا کوئی اثر اس میں پایا جاتا ہو' بلکہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف ہو۔ خالص نیت اور عمل بھی اسی طرح ہوتے ہیں' سوائے رضائے الٰہی کے کوئی اور محرک اُن پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ (المحجۃ البیضا۔ ج ۸۔ ص ۱۲۸)

قرآنِ کریم میں بارہا اخلاص' مخلصین اور مخلَصین کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری ہے: فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اللہ کو پکارو اور اپنے دین کو اسکے لئے خالص کرو۔ سورۂ غافر

۴۰۔ آیت ۱۴)

ایک دوسرے مقام پر پیغمبر اسلام کو خطاب کیا گیا ہے کہ: قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (کہہ دیجئے کہ میں اس بات پر مامور ہوں کہ خدا کی عبادت کروں' اس حال میں کہ اپنے دین کو اس کے لئے خالص کروں۔ سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۱۱)

قرآنِ مجید میں شیطان کی زبانی نقل ہوا ہے کہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ خدا سے کہتا ہے کہ: فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (تیری عزت کی قسم' میں تمام انسانوں کو گمراہ کردوں گا علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہوں نے خود کو خالص کرلیا ہوگا۔ سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۸۲' ۸۳)

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: لَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ عَابِداً لِلّٰهِ حَقَّ عِبَادَتِهِ حَتّٰى يَنْقَطِعَ عَنِ الْخَلْقِ كُلِّهِ اِلَيْهِ' فَحِيْنَئِذٍ يَقُوْلُ هٰذَا خَالِصٌ لِي فَيَقْبَلُهُ بِكَرَمِهِ (کوئی عبادت گزار خدا کا حقِ عبادت ادا نہیں کرسکتا علاوہ اس کے جو مخلوقات (پر بھروسہ کرنے) سے منھ موڑ کر صرف اسی (خدا) کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر خداوندِ عالم فرماتا ہے: یہ شخص میرے لئے خالص ہوا ہے۔ پس وہ اپنے کرم سے اسے قبول کرتا ہے۔ مستدرک الوسائل۔ ج ۱۔ ص ۱۰۱)

مختصر یہ کہ خداوندِ رحمٰن کے منتخب اور پسندیدہ بندوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خلوص اور معرفت کے ساتھ عبادت کو انتہائی اہمیت دیتے ہیں اور ہمیشہ شب و روز خالص نیت اور محکم ارادے کے ہمراہ خدا کے راستے پر قدم بڑھاتے ہیں اور بندگی کے اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو دوسرے تمام مقامات کی بنیاد کا پتھر ہے۔

انبیاءؑ' ائمہ اور اولیائے الٰہی کی سب سے اوّلین خصوصیت یہ تھی کہ وہ خدا کے خالص اور مخلص بندے تھے اور اپنی اس صفت پر فخر کا اظہار کرتے اور اس میدان میں انتہائی سعی و کوشش میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں تک کہ مثلاً حضرت علی اور امام سجادؑ کبھی کبھی ایک ایک رات میں ہزار ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے اور دوسری تمام عبادات کے دوران بھی اپنی انتہائی توانائیوں کے ساتھ کوشاں رہتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اگر تم خدا کی عبادت کی مٹھاس اور لذت کو جان لو اور اسکی برکات کو دیکھ لو اور اسکے نور کے سائے سے بہرہ مند ہو تو ایک لمحے کے لئے بھی اس سے دور نہ ہو۔ ہر چند تم عبادت کی مشقت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ۔ ایسا شخص جو عبادت الٰہی سے گریزاں ہے اس (صورتحال) کی وجہ سوائے اسکے اور کوئی نہیں کہ وہ عصمت و توفیق کے ممتاز آثار و فوائد سے محروم ہے۔"

(مصباح الشریعۃ۔ ص ۵۵' بحار الانوار۔ ج ۷۰۔ ص ۶۹)

اسی بنا پر آپ اپنے محترم اجداد کی مانند اور پیغمبر اسلام اور حضرت علی کی پیروی میں خدا کی عبادت' اس سے راز و نیاز اور مناجات کے ہر موقع سے استفادہ کرتے تھے۔

حسن اختتام کے طور پر قارئین کی توجہ درج ذیل قصے کی جانب مبذول کراتے ہیں:

ابن ابی یعفور کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کئے ہوئے فرما رہے ہیں: رَبِّ لَا تَكِلْنِي إِلَىٰ نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ أَبَدًا لَا أَقَلَّ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ (بارالٰہا! مجھے کسی صورت پلک جھپکنے کے لئے بھی میرے اپنے حال پر نہ چھوڑ دینا اور نہ ہی اس سے کم وقت کے لئے اور نہ اس سے زیادہ وقت کے لئے)

اس موقع پر میں نے دیکھا کہ آپ کی ریش مبارک کے دونوں اطراف سے آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے ہیں۔

پھر آپ نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا: اے ابن ابی یعفور! خداوند عالم نے پلک جھپکنے کے وقت سے بھی کم عرصے کے لئے (حضرت) یونس پیغمبر کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور ان کیلئے وہ ماجرا (ترک اولیٰ اور مچھلی کے شکم میں چلے جانا۔۔۔) پیش آیا تھا۔

ابن ابی یعفور نے کہا: کیا حضرت یونس کا معاملہ (نعوذ باللہ) کفر کی حد تک پہنچ گیا تھا؟

امام نے فرمایا: نہیں! لیکن اگر کوئی بغیر توبہ کئے اس حال میں مر جائے تو ایسا شخص ہلاکت کی موت مرا ہے۔ (اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۵۸۱)

خوف و خشیتِ الٰہی

قرآن مجید میں خدا کے خاص اور ممتاز بندوں کی چوتھی خصوصیت کے بارے میں آیا ہے کہ: وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا (اور یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ پروردگار ہم سے عذاب جہنم کو پھیر دے کہ اسکا عذاب بہت سخت اور پائیدار ہے۔ وہ بدترین منزل اور محل اقامت ہے۔ سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۶۵' ۶۶)

خداوند عالم نے اس آیۂ شریفہ میں اپنے خاص اور ممتاز بندوں کی چوتھی خصوصیت کی جانب اشارہ کیا ہے جو "خوف و خشیتِ الٰہی" کی صفت ہے۔ یعنی یہ لوگ خدا کی نافرمانی کے برے انجام سے شدت کے ساتھ خوفزدہ رہتے ہیں اور اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا کی نافرمانی کے معنی شیطان کے حکم کی تعمیل ہے اور یہ عمل عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے اور دوزخ میں ڈالے جانے کا باعث ہوگا۔

یہ لوگ گناہ کے انجام اور دوزخ کے عذاب سے اس قدر خائف اور ہراساں رہتے ہیں کہ ان کی یہ باطنی کیفیت اپنا اظہار کرتی ہے اور وہ انتہائی عاجزی کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں دستِ دعا بلند کرتے ہوئے التماس کرتے ہیں کہ: بارالٰہا! ہمیں مجرموں کے لئے تیار کئے گئے

دوزخ کے سخت عذاب سے دور رکھنا۔

اس طرح یہ لوگ قدرتی طور پر عذاب الٰہی کی وجہ بننے والے عوامل سے پرہیز کرنے لگتے ہیں اور فرامین الٰہی کی تعمیل اور احکامِ الٰہی کی انجام دہی کے ذریعے خداوند عالم کی بے پایاں رحمت کو اپنی جانب جلب اور جذب کرتے ہیں۔

ان لوگوں پر یہ حالت ہمیشہ طاری رہتی ہے' اور ایک لمحے کے لئے بھی خوف خدا ان سے دور نہیں ہوتا۔ یہ لوگ غرور و غفلت میں مست' مدہوش اور بے پرواہ زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی طرح خدا کی اس وعید کو ہنسی مذاق نہیں سمجھتے۔

خوف کے معنی' باطنی ڈر اور وحشت ہے۔ لہٰذا اسے ترک گناہ اور ہر قسم کے جرم سے دوری کے لئے ایک باطنی ہتھیار شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قانون' عدالت' جرمانے' قید اور سزاؤں کے خوف کی وجہ سے انسان جرائم کا مرتکب نہیں ہوتا اور یہ سوچ کر لاقانونیت سے گریز کرتا ہے کہ کہیں اسے سزا کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لہٰذا خوف خدا کے معنی اللہ رب العزت کی ذات پاک سے ڈر اور وحشت نہیں' بلکہ اسکے معنی اسکے قانون اور اسکی عدالت سے ڈرنا ہیں۔

خوف خدا پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان عدل الٰہی کے پیمانے پر اپنے اعمال کا وزن کرے۔ لہٰذا خوف کے معنی ان سزاؤں کو ناگوار سمجھنا ہے جو گناہ اور خدا کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

قرآن مجید انبیائے الٰہی کا تعارف بشیر و نذیر کی حیثیت سے کراتا ہے۔ یعنی یہ ہستیاں انسانون کو رحمت الٰہی' بہشت اور بے پایاں جزا و ثواب کی نوید بھی دیتی ہیں' اور انہیں خبردار کرتے ہوئے گناہ کے خطرناک انجام سے متنبہ بھی کرتی ہیں۔

انبیا کی یہ دو صفات' اس بات کی ترجمان ہیں کہ مومن کو چاہئے کہ وہ خوف اور امید کے بین بین زندگی بسر کرے۔ خدا کی رحمت کی امید بھی رکھے اور اس سے خوف بھی کھائے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے۔ اگر کوئی ان میں سے کسی ایک کو اپنا لے اور دوسرے کو چھوڑ دے تو یہ اس کے لئے باعث خطر ہے۔ کیونکہ اگر وہ صرف (رحمت الٰہی) کا امیدوار رہا' تو دھوکے میں پڑ

جائے گا اور خدا کی رحمت واسعہ کی امید پر ہر گناہ میں ہاتھ رنگنے لگے گا۔ اس کے برخلاف اگر وہ صرف خوفزدہ رہا' تو یاس و ناامیدی میں مبتلا ہو جائے گا اور یہ حالت انسان کو افسردگی اور خستگی میں مبتلا کر دے گی' اس کے اندر سے ولولہ' نشاط اور آگے بڑھنے کی امنگ ختم کر کے اسکی پیشرفت کو روک دے گی۔

اسی بنیاد پر بہت سی روایات کے مطابق پیغمبر اسلام اور ائمہ اطہار نے فرمایا ہے کہ: مومن خوف اور رجا (امید) کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے اور اس میں یہ دونوں خصوصیات مساوی طور پر پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: میرے والد امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے تھے کہ: اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَفِي قَلْبِهِ نُورَانِ نُورُ خِيفَةٍ وَ نُورُ رَجَاءٍ لَوْ وُزِنَ هٰذَا لَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا وَلَوْ وُزِنَ هٰذَا لَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا (کوئی شخص مومن نہیں' سوائے اسکے جس کے دل میں دو نور پائے جاتے ہوں۔ نور خوف اور نور امید۔ اگر اس میں ان دونوں کا باہم وزن کیا جائے تو دونوں کا وزن برابر ہو گا۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۷۱۔ از محدث کلینی)

یہ نکتہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ سورۂ زمر کی آٹھویں اور نویں آیت میں غیر مومن اور مومن انسان کا موازنہ کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ پہلا گروہ (یعنی غیر مومن گروہ) بلا اور مصیبت کے موقع پر خوفزدہ ہو جاتا ہے اور نعمت و آسائش کے موقع پر مغرور اور خدا سے بے خبر' جبکہ دوسرا گروہ (مومنوں کا گروہ) ہمیشہ خائف اور امیدوار رہتا ہے۔ یہ دونوں گروہ کسی صورت برابر نہیں ہو سکتے۔ بلکہ پہلا گروہ گمراہ اور دوسرا گروہ راہ راست پر گامزن ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو: يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (عذاب آخرت سے ڈرتے ہیں اور رحمت پروردگار سے امید رکھتے ہیں۔ سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۹)

قرآن کی نظر میں خوف اور اسکے مراتب

قرآن کریم کی متعدد آیات میں خوف و خشیت الٰہی کی اہمیت اور مختلف ابعاد میں اسکے درجات کا تذکرہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ سجدہ کی آیت سولہ میں' سچے اور حقیقی مومنین کی

شان میں فرمایا گیا ہے: تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (ان کے پہلو بستر سے جدا رہتے ہیں اور (قیام کی حالت میں خدا کی طرف رخ کر کے) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔ سورۂ سجدہ ۳۲۔ آیت ۱۶)

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خوف اور امید' خدا کے ان مخلص بندوں کی شب بیداریوں اور ان کے خدا سے مضبوط تعلق کا سبب اور وجہ ہیں اور یہ لوگ خوف اور امید کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔

سورۂ نازعات کی آیات نمبر چالیس اور اکتالیس میں ہے کہ: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا ہے' تو جنت اسکا ٹھکانہ اور مرکز ہے۔ سورۂ نازعات ۷۹۔ آیت ۴۰' ۴۱) اس آیت کی بنیاد پر' خوفِ خدا ترکِ گناہ کا مقدمہ ہے اور اسکا نتیجہ خدا کا اجرِ عظیم یعنی جنت ہے۔

اسی بات کو سورۂ رحمٰن کی چھیالیسویں آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (اور جو شخص بھی اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے' اسکے لئے جنت میں دو باغات ہیں۔ سورہ رحمٰن ۵۵۔ آیت ۴۶)

جب ہم عظمتِ الٰہی کے سامنے خوف و ہراس سے متعلق آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ اس خصلت کے بارے میں ایسے مختلف الفاظ اور تعبیرات کے ذریعے گفتگو کی گئی ہے' جن میں سے ہر ایک مختلف انسانوں کے خوف و ہراس کے درجات اور مراتب کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

مرحوم شیخ صدوقؒ نے کتاب ''خصال'' میں قرآنِ کریم کی روشنی میں خوف کو پانچ اقسام میں قرار دیا ہے اور ان میں سے ہر قسم کے لئے ایک آیت کا ذکر کیا ہے۔ یہ پانچ اقسام درج ذیل ہیں: ۱- خوف ۲- خشیت ۳- وجل ۴- رہبت ۵- ہیبت۔ اسکے بعد ان کے بارے میں ذرا تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ خوف' گناہگاروں کے لئے ہے۔ خشیت' علما کے

لئے ہے۔ وجل (دل کا خوفزدہ ہونا)' انکساری کے ساتھ تسلیم ہونے والوں کے لئے ہے۔ رہبت' عابدوں کے لئے ہے اور ہیبت کا تعلق عارفوں سے ہے۔

پھر ان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ: خوف' گناہوں کی وجہ سے ہے۔ خشیت' وظائف و فرائض کی انجامدہی میں کوتاہی کے احساس کی وجہ سے طاری ہونے والا خوف و ہراس ہے۔ وجل اور قلبی خوف و ہراس' خدمت ترک کرنے کی وجہ سے ہے۔ رہبت' عبادت میں تقصیر اور کوتاہی کے احساس کی وجہ سے ہے۔ اور ہیبت' اسرار کے انکشاف کے وقت شہودِ حق کی وجہ سے خدا کے لامتناہی شکوہ و عظمت سے خوف و ہراس کا نام ہے۔ (خصال۔ ج ۱۔ ص ۲۸۳)

خوف کے مراتب کے بارے میں ایک دوسرا موضوع یہ ہے کہ خوف شدت اور ضعف رکھتا ہے۔ جو شخص خوف کے جس مرتبے کا حامل ہو' اسی کی مناسبت سے مقامات حاصل کرتا ہے۔ وہ ہستیاں جو خدا سے سب سے زیادہ نزدیک ہیں' مثلاً انبیا' ائمہ اور اولیائے الٰہی' ان میں خدا کا شدید ترین خوف پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ رات کے درمیانی حصے میں اپنی نمازوں اور مناجات کے دوران خوفِ خدا سے گریہ و نالہ و فغاں کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے بہنے والے شفاف آنسوؤں سے اپنی روح کو دھوتے ہیں' اور اپنے شوق و خوف کے آنسوؤں کے ذریعے اپنے پرزور احساسات کے ساتھ اپنی انتہائی تواضع اور کمالِ بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس قسم کا گریہ و زاری اس قدر پسندیدہ اور قدر و قیمت کا حامل ہے کہ بقول پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مَنْ ذَرَفَتْ عَيْنَاهُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ' كَانَ لَهُ بِكُلِّ قَطْرَةٍ مِنْ دُمُوْعِهٖ مِثْلَ جَبَلِ اُحُدٍ يَكُوْن فِي مِيزَانِهٖ فِي الْاَجْرِ (جس کی آنکھ خوفِ خدا سے بہنے والے آنسوؤں سے تر ہو جائے' اسکے آنسوؤں کا ہر قطرہ روزِ قیامت اسکے میزانِ عمل میں احد کے پہاڑ کی مانند وزن رکھے گا۔ بحار الانوار۔ ج ۹۳۔ ص ۳۳۴)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: اَلْبُكَاءُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ مِفْتَاحُ رَحْمَةِ اللهِ (خوفِ خدا سے رونا' رحمتِ الٰہی کا دروازہ کھولنے کی کنجی ہے۔ غرر الحکم)

پیغمبر اسلام اور ائمۂ اطہار کے کلام میں خوف کی اہمیت

اس بات کے پیش نظر کہ عظمتِ الٰہی کے مقابل خوفزدہ ہونا تہذیب وتکامل کا ایک قوی عامل ہے اور اگر کسی میں یہ خصلت قوی اور راسخ ہو جائے تو وہ اس انسان کے راستے سے راہِ کمال کی ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے۔ پیغمبر اسلام اور ائمۂ معصومین کے کلام میں اس خصلت کو بہت زیادہ سراہا گیا ہے اور خوفِ خدا نہ رکھنے کی مذمت کی گئی ہے۔ محترم قارئین کی توجہ اس سلسلے میں رسولِ مقبول اور ائمۂ اطہار کے چند اقوال کی جانب مبذول کراتے ہیں:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَعْلَی النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَاللهِ اَخْوَفُهُمْ مِنْهُ (خدا کے نزدیک لوگوں میں اعلیٰ وارفع مقام کے حامل افراد وہ لوگ ہیں جو ان میں سے زیادہ خوفِ خدا رکھتے ہیں۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۸۰)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جب قیامت برپا ہوگی تو منادیٔ حق ندا دے گا کہ: اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اَقْرَبَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ اللهِ اَشَدُّكُمْ مِنْهُ خَوْفاً (اے لوگو! آج بارگاہِ خدا میں تم سب سے مقرب ترین شخص وہ ہے جو دنیا میں دوسروں سے زیادہ خدا کی عظمت سے خوفزدہ تھا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۴۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: لَایَكُونُ الْعَبْدُ مُؤْمِناً حَتّٰی یَكُونَ خَائِفاً رَاجِیاً (کوئی بندۂ خدا اس وقت تک ایمان کے درجۂ کمال تک نہیں پہنچتا، جب تک اس میں خوف اور امید کی خصلتیں نہ پائی جاتی ہوں۔ بحار الانوار۔ ج ۷۰۔ ص ۳۹۲)

البتہ یہ بات واضح ہے کہ سچا خوف وہ ہوتا ہے جو اطاعت اور ترکِ معصیت کا موجب بنے اور اسکی علامات عمل سے ظاہر ہوں، جبکہ جھوٹا خوف کھوکھلا اور غیر موثر ہوتا ہے۔

اسی بنیاد پر امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ خَافَ اللّٰهَ وَمَنْ خَافَ اللّٰهَ سَخَتْ نَفْسُهُ عَنِ الدُّنْیَا (جو شخص خدا کی معرفت رکھتا ہے وہ اس سے خوف کھاتا ہے اور جو شخص خوفِ خدا رکھتا ہے وہ دنیا کا شیفتہ نہیں ہوتا۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۶۸)

امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی کا کہنا ہے کہ میں نے امام سے عرض کیا: بعض لوگ گناہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کی رحمت سے (مغفرت کی) امید رکھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ہمیشہ یہی خیال رہتا ہے، یہاں تک کہ موت ان کے سر پر آ پہنچتی ہے (اور وہ اسی حالت میں مر جاتے ہیں۔ کیا انہیں ان کی اس امید کا کوئی نتیجہ حاصل ہوگا؟)

امام نے فرمایا: اس قسم کے لوگ، ایسے افراد جو اپنی آرزوؤں ہی میں مگن رہتے ہیں، یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ لوگ (دراصل) امیدوار نہیں ہوتے۔ جو شخص کسی چیز کی امید رکھتا ہے؟ اسکا طلبگار رہتا ہے، اور جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے، اس سے گریز کرتا ہے (اس خصلت سے عاری یہ لوگ درحقیقت خدا سے روگرداں ہیں اور عذاب کے موجبات، جو گناہ ہیں کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں) (اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۶۸)

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے: لَا خَوْفَ كَخَوْفِ حَاجِزٍ، وَلَا رَجَاءَ كَرَجَاءِ مُعِينٍ (کوئی خوف، اس خوف کی مانند گراں قیمت نہیں جو گناہ سے باز رکھتا ہے۔ اور کوئی امید اس امید سے گراں قدر نہیں جو (توبہ اور عواملِ نجات کے سلسلے میں) مددگار ہوتی ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۰۔ ص ۱۶۴)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: اَلْعَجَبُ مِمَّنْ یَخَافُ الْعِقَابَ فَلَمْ یَكُفَّ، وَرَجَا الثَّوَابَ فَلَمْ یَتُبْ (باعثِ تعجب ہے وہ شخص جو عذابِ الٰہی سے ڈرتا ہے لیکن اپنے آپ کو گناہوں سے باز نہیں رکھتا اور ثواب و پاداشِ الٰہی کی امید رکھتا ہے لیکن توبہ نہیں کرتا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۲۳۷)

امام حسین علیہ السلام "دعائے عرفہ" میں ایک مقام پر خدا سے عرض کرتے ہیں کہ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِی اَخْشَاكَ كَاَنِّی اَرَاكَ (بارالٰہا! مجھے اپنی بارگاہ میں ایسا خائف بنا دے کہ گویا میں تجھے دیکھ رہا ہوں)

تجزیہ وتحلیل اور جمع بندی

مذکورہ بالا گفتگو سے استفادہ ہوتا ہے کہ خوف کی خصلت، خداوند عالم کے ممتاز اور خاص

بندوں کی خصوصیت اور ایک اعلیٰ اور تعمیری انسانی فضیلت ہے۔ خوف صرف زبان اور حالت کے ذریعے اظہار کا نام نہیں بلکہ کامل خوف وہ ہے جس کے آثار عمل میں دکھائی دیں اور جو گناہوں سے دوری کا قوی عامل بنے۔

خوف کے اعلیٰ مراحل وہ ہیں کہ انسان رات کی تنہائی میں خدا کے ساتھ راز و نیاز اور اس سے مناجات کے دوران گریہ وزاری کرے اور انتہائی عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنا دل خدا سے وابستہ رکھے اور اپنے آپ کو خدا کی عظمت کے سامنے ایک ناچیز ذرّہ سمجھے۔

مومن خائف بھی ہوتا ہے اور امیدوار بھی، وہ اپنے اندر یہ دونوں خصلتیں مساوی طور پر پروان چڑھاتا ہے اور ان دو پروں کے ذریعے دنیائے سماوی کی بلندیوں میں پرواز کرتا ہے اور ان دو انوار کے ذریعے اپنے قلب کو پرنور اور روح کو پاکیزگی اور صفا سے سرشار کرتا ہے۔

خوف و رجا کا مسئلہ تربیتی مسائل میں تعلیم کے بنیادی ارکان و اصول میں سے ہے۔ اسی بنا پر انبیا علیہم السلام نذیر بھی تھے اور بشیر بھی۔ مثال کے طور پر اگر جماعت کا استاد اپنے طالب علموں سے کہے کہ اس سال تمام طلبا پاس ہو جائیں گے، اس طرح انہیں صرف امید دے، خوف نہ دے، تو طلبا مطمئن ہو کے، دھوکے میں آ کے تصور کرنے لگیں گے کہ وہ سب پاس ہو جائیں گے اور اس طرح پڑھائی لکھائی سے غفلت اور سستی برتنے لگیں گے۔ اسکے برعکس اگر استاد کہے کہ اس سال تم سب فیل ہو جاؤ گے، تو ان الفاظ سے استاد اپنے تمام طالب علموں کو مایوس اور ناامید کر دے گا، اور ان میں پڑھنے کی امنگ اور جوش وخروش کو ٹھنڈا کر دے گا۔ اور اسکا نتیجہ بھی وہی نکلے گا کہ طالب علموں کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو جائے گا اور ان میں پڑھنے کی تمنا اور جوش وخروش ختم ہو جائے گا۔

سمجھدار اور لائق معلم وہ ہے جو نذیر (خوف دلانے والا) بھی ہو اور بشیر (خوش خبری اور امید دلانے والا) بھی، جو امید بھی دلائے اور خوف بھی اور اپنے طالب علموں کو ان دو خصلتوں کے درمیان رکھے۔ کیونکہ یہ اعتدال اور دونوں خصائل کی آمیزش شوق و رغبت، حرکت وعمل اور نورانیت و پاکیزگی کا موجب ہے۔

خوف و رجا کے درمیان اعتدال کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسلامی روایات میں ناامیدی (جو رجا کی ضد ہے) اور عذاب الٰہی سے امان وحفاظت (جو خوف کی ضد ہے) کو دو گناہانِ کبیرہ شمار کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ صحیح روایت میں نقل ہوا ہے کہ: عمرو بن عبید امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: مجھے ان گناہانِ کبیرہ سے آگاہ فرمایئے جن کا قرآنِ کریم میں ذکر ہوا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے انہیں انیس گناہ گنوائے۔ اور ان میں سے ہر گناہ کے بارے میں ایک آیت قرآن بطور دلیل پیش کی۔ امام نے ان انیس گناہوں میں عذاب الٰہی سے محفوظ ہونے اور ناامیدی کو بھی شمار کیا اور فرمایا: خدا کے ساتھ شرک کے بعد (دوسرے نمبر کا گناہِ کبیرہ) رحمتِ الٰہی سے یاس و ناامیدی ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (کفار کے سوا کوئی رحمت خدا سے ناامید نہیں ہوتا۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۸۷)

پھر امام نے فرمایا: اسکے بعد (یعنی تیسرے نمبر کا گناہِ کبیرہ) خدا کے مکر و عذاب سے تحفظ کا احساس (یعنی خدا سے خوف نہ کھانا) ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید فرماتا ہے: اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (کیا یہ لوگ خدائی تدبیر کی طرف سے مطمئن ہو گئے ہیں، جب کہ ایسا اطمینان صرف گھاٹے میں رہنے والوں کو ہوتا ہے۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۹۹) (اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۲۸۵)

اس گفتگو کو ہم اس معروف قصے پر ختم کرتے ہیں جو قیامت کے وحشتناک حوادث سے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے خوف کی نشاندہی کرتا ہے: امام حسن علیہ السلام اپنی حیات کے آخری لمحات میں خوفِ خدا سے گریہ کر رہے تھے۔ وہاں موجود لوگوں میں سے ایک نے سوال کیا: اے فرزند رسول! آپ جو بارگاہِ الٰہی میں انتہائی بلند درجے اور مقام کے حامل ہیں، آپ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام نے بشارت فرمایا ہے۔ آپ جو بیس مرتبہ پیدل حج کے لئے مکہ تشریف لے گئے ہیں، تین مرتبہ آپ نے اپنا تمام مال و دولت راہِ خدا میں ضرورت مندوں کو بخشا ہے۔ (لہٰذا موت کا یہ سفر تو آپ کے لئے مبارک و مسعود سفر ہے) اسکے باوجود آپ کیوں

گریہ فرما رہے ہیں؟

امام حسن علیہ السلام نے جواب دیا: اِنَّمَا اَبْکِی لِخَصْلَتَیْنِ: لِهَوْلِ الْمُطَّلَعِ وَ فِرَاقِ الاَحِبَّهِ (جان لو کہ میں دو وجوہات کی بنا پر رو رہا ہوں' ایک روز قیامت کی وحشت کی وجہ سے' کہ اس روز ہر کوئی حالات سے آگاہی اور نجات کی کوئی راہ تلاش کرنے کی غرض سے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہا ہوگا اور دوسری وجہ دوستوں کی جدائی ہے۔ (امالی شیخ صدوق۔ مجلس ۳۹۔ حدیث ۹)

انفاق اور خرچ میں اعتدال

قرآنِ کریم خداوندِ رحمان کے خاص اور ممتاز بندوں کی پانچویں خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے: وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا وَ کَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (یہ لوگ وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف (فضول خرچی) کرتے ہیں اور نہ بخل (کنجوسی) سے کام لیتے ہیں' بلکہ ان دونوں کے درمیان' اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اپناتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۷)

اس آیت میں زندگی کے ایک اہم ترین مسئلے کا ذکر کیا گیا ہے' جسے ملحوظ اور پیش نظر رکھنا فرد اور معاشرے کی آسائش' فلاح اور اطمینان کا باعث ہے اور بہت سی سماجی اور اقتصادی مشکلات کے حل اور خرابیوں کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ یہ اہم ترین مسئلہ خرچ میں اعتدال اور میانہ روی ہے۔

اعتدال' یعنی میانہ روی' یعنی حد سے زیادہ بڑھنے اور حد سے کم ہونے کی درمیانی لکیر۔ اسلام تمام امور و معاملات میں اس طرزِ عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اسلام کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں کو امتِ وسط' یعنی معتدل امت کہا گیا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (اور اسی طرح ہم نے تمہیں امتِ وسط قرار دیا ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۴۳)

حضرت علی علیہ السلام نے ان لوگوں کو جاہل قرار دیا ہے جو اعتدال سے نکل کر افراط یا تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: لَا تَرَی الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطاً اَوْ مُفَرِّطاً (جاہل کو ہمیشہ افراط یا تفریط کا شکار دیکھو گے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۷۰)

زیر بحث آیت جو (سورۂ فرقان میں بیان ہونے والی) خداوندِ عالم کے ممتاز اور خاص بندوں کی پانچویں خصوصیت کے بیان پر مشتمل ہے اس میں اعتدال کے ایک اہم ترین شعبے پر گفتگو کی گئی ہے جس کا تعلق اقتصادی امور اور اجتماعی وسماجی زندگی سے ہے اور جو زندگی کی اصلاح وبہتری اور خوشگوار اجتماعی اور عائلی حیات کے سلسلے میں اہم کردار کی حامل ہے اور وہ خصوصیت ''خرچ میں میانہ روی'' کی خصوصیت ہے۔ یعنی مردِ مسلمان کو چاہئے کہ خرچ کرتے ہوئے نہ اسراف اور فضول خرچی کرے اور نہ کنجوسی اور بخل سے کام لے بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اپنائے۔

اسلام میں فضول خرچی کی مذمت

کسی بھی عمل میں حدِ اعتدال سے کسی بھی قسم کی افراط تجاوز اور زیادتی اسراف کہلاتی ہے۔ مثلاً ایک وقت کے کھانے کیلئے چھ سوگرام غذا کافی ہے۔ اب اگر کوئی اپنے لئے ایک کلوگرام غذا بنائے اس میں سے آٹھ سوگرام کھائے اور باقی بچ جانے والی دو سوگرام غذا کو پھینک دے تو اس نے ایک وقت کے کھانے میں دو طرح کا اسراف اور فضول خرچی کی ہے۔ ایک یہ کہ اس نے دو سوگرام غذا زیادہ کھائی ہے اور دوسرے یہ کہ آٹھ سوگرام سے زیادہ جو دو سوگرام غذا تیار کی تھی اسے کوڑے دان میں پھینک دیا ہے۔ اس طرح اس نے ایک وقت کے کھانے میں چار سوگرام غذا فضول خرچ کی ہے۔

اس مثال کو سامنے رکھ کر اور اس کی روشنی میں زندگی کے دوسرے مختلف پہلوؤں اور شعبوں کا جائزہ لے کر ہم بآسانی جان سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مختلف صورتوں میں کس قدر اسراف اور فضول خرچی ہوتی ہے۔

اسراف کی مختلف شکلیں ہیں اس کی ایک شکل جس سے زیر بحث آیت میں روکا گیا ہے

خرچ میں اسراف ہے۔ جیسے کھانے پینے میں اسراف کھانے کو پھینک کر ضائع کرنے میں اسراف فضول تکلفات اور بے جا تزئین وآرائش وغیرہ میں اسراف۔ حتیٰ اگر عبادات کے دوران بھی افراط ہونے لگے مثلاً کوئی وضو اور غسل میں عقلی اور فطری حد سے زیادہ پانی خرچ کرے تو یہ بھی اسراف ہے۔ اسی بنیاد پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: فِی الْوُضُوْءِ اِسْرَافٌ وَفِی کُلِّ شَیْءٍ اِسْرَافٌ (وضو اور ہر چیز میں اسراف ہو سکتا ہے۔ کنز العمال۔ حدیث ۲۶۲۴۸)

عباسی نامی ایک شخص امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور گھر میں بیوی بچوں کی ضروریات اور دوسرے امور کے بارے میں اخراجات کے سلسلے میں امام سے رہنمائی طلب کی: امام رضا علیہ السلام نے اس سے فرمایا: تمہارے خرچ کو دو ناپسندیدہ کاموں (فضول خرچی اور کنجوسی) کے درمیان ہونا چاہئے۔

عباسی نے پوچھا: اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

فرمایا: کیا تم نے قرآن کریم میں خداوندِ عالم کا وہ کلام نہیں پڑھا جس میں اس نے فضول خرچی اور کنجوسی دونوں کو ناپسند قرار دیا ہے اور (خدا کے ممتاز بندوں کے اوصاف میں) فرمایا ہے کہ: وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں کا درمیانی راستہ اپناتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۷) لہٰذا اپنے افرادِ خانہ کے اخراجات اور ان کی ضروریاتِ زندگی کی خریداری اور ان چیزوں کو خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لو۔ (سفینۃ البحار از محدث قمی۔ ج ۱۔ ص ۶۱۵ اور بحار الانوار از علامہ مجلسی۔ ج ۷۱۔ ص ۳۴۷)

ایک دوسری روایت کے مطابق ایک روز امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے سامنے اسی (مذکورہ بالا) آیت کی تلاوت فرمائی اور پھر زمین سے مٹھی بھر سنگریزے اٹھا کے انہیں سختی کے ساتھ ہاتھ میں بھینچا اور فرمایا: یہ بخل اور سخت گیری ہے (جس کی آیت میں ممانعت کی گئی ہے)۔ پھر آپ نے سنگریزوں کی ایک اور مٹھی اٹھائی اور اس طرح اپنے ہاتھ کو کھولا کہ وہ سب

آدِقُّوا اَقلامَکُمْ، وقارِبُوا بَیْنَ سُطُورِکُمْ، وَاحْذِفُوا عَنْ فُضُولِکُمْ وَاقْصُدُوا وَالْمَعانِیْ، وَاِیّاکُمْ وَالْاِکْثارَ، فَاِنَّ اَمْوالَ الْمُسْلِمِیْنَ لَا تَحْتَمِلُ الضَّرَرَ (اپنے قلموں کی نوک کو باریک تراشو' سطروں کے درمیان فاصلہ کم رکھو' زیادہ الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرو' معانی کے بیان کو مطمع نظر قرار دو' فضول اور زیادہ باتوں سے دور رہو تاکہ مسلمانوں کے مال کو نقصان نہ پہنچے۔ بحارالانوار از علامہ مجلسی۔ ج ۴۱۔ ص ۱۰۵)

نیز آپ ہی نے فرمایا ہے: یاد رکھو کہ مال کا ناحق عطا کر دینا بھی اسراف اور فضول خرچی میں شمار ہوتا ہے۔ اگر یہ عمل انسان کی دنیا میں بلندی کا باعث بنے بھی' تو آخرت میں اسے پست کر دیتا ہے' اور اگر لوگوں کی نظر میں قابلِ احترام بنا بھی دے' تو خدا کی نگاہ میں ذلیل کر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص مال کو ناحق یا نااہل پر خرچ کرتا ہے تو پروردگار اسے اسکے شکرانے سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۲۴)

مَنْ اَنْفَقَ شَیْئًا فِیْ غَیْرِ طَاعَةِ اللّٰهِ فَهُوَ مُبَذِّرٌ (جو شخص اپنی کسی چیز کو اطاعتِ خدا کے سوا کسی اور مقصد میں صرف کرے' وہ مسرف (فضول خرچ) ہے۔ بحارالانوار از علامہ مجلسی۔ ج ۷۲۔ ص ۳۰۲)

یاسر خادم کہتے ہیں: ایک روز امام رضا علیہ السلام کے کچھ غلام پھل کھا رہے تھے اور انہیں پوری طرح کھائے بغیر ایک کونے میں پھینکتے جاتے تھے۔ امام نے جب ان کا یہ مسرفانہ عمل دیکھا تو ناراض ہو کر ان سے فرمایا: سبحان اللہ! اگر تمہیں ان پھلوں کی ضرورت نہیں' تو دوسرے انسان ہیں جنہیں ان کی ضرورت ہے۔ تم (آدھے کھائے ہوئے) یہ پھل کیوں دور پھینک رہے ہو؟ انہیں اٹھاؤ اور ضرورت مندوں کو دے دو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے کھجور کی گٹھلیوں کو پھینکنے سے منع کرتے ہوئے اور مسرفوں (فضول خرچ کرنے والوں) کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا: حتیٰ برتن کی تہہ میں بچے ہوئے پانی کو بھی نہ پھینکو کہ یہ بھی اسراف (فضول خرچی) ہے۔ (انوار البہیہ از محدث قمی۔ ص ۳۲۹' بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۳۴۶)

سنگریزے زمین پر گر گئے' اور فرمایا: یہ اسراف ہے۔ پھر تیسری مرتبہ مٹھی بھر سنگریزے اٹھائے اور اپنا ہاتھ تھوڑا سا کھولا' اتنا کہ کچھ سنگریزے گر گئے' اور کچھ آپ کے ہاتھ ہی میں رہے' اور فرمایا: یہ اسراف اور کنجوسی کے درمیان پایا جانے والا اعتدال ہے۔ (تفسیر نور الثقلین۔ ج ۴۔ ص ۳۹ از محدث خبیر عبد علی بن جمعہ حویزی)

قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ فرمایئے:

"كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا."

"کھاؤ اور پیو مگر فضول خرچی نہ کرو۔" (سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۳۱)

"وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ."

"فضول خرچی نہ کرنا' کہ خدا فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(سورۂ انعام ۶۔ آیت ۱۴۱)

"وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا."

"اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر رکھو اور نہ بالکل کھلا چھوڑ دو کہ آخر میں خالی ہاتھ اور قابلِ ملامت ہو جاؤ۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۹)

اسی آیت اور حکمِ الٰہی کو سامنے رکھ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: مَا مِنْ نَفَقَةٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ نَفَقَةِ قَصْدٍ وَيُبْغِضُ الْاِسْرَافَ (خدا کے نزدیک کوئی بھی انفاق (خرچ)' اعتدال پر مبنی انفاق سے بڑھ کر پسندیدہ نہیں۔ خدا انفاق میں اسراف کو پسند نہیں کرتا۔ قصار الجمل از آیت اللہ علی مشکینی۔ ص ۳۰۵)

یہی وجہ تھی کہ رسولِ مقبول' امیر المومنین اور تمام ائمۂ اطہار انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ہر قسم کی شان و شوکت کے اظہار اور بے جا تکلفات سے سختی کے ساتھ گریزاں رہتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اہل کاروں کے نام ایک خط میں لکھا کہ:

امام خمینی کا فضول خرچی سے شدید پرہیز کرنا

حضرت امام خمینی علیہ الرحمہ جو اسلامی احکام و فرامین پر عمل کے معاملے میں انتہائی سخت گیر تھے اور اس سلسلے میں مثالی حیثیت کے حامل ہیں آپ تمام باتوں اور خصوصاً اخراجات میں فضول خرچی کے حوالے سے بھی بہت زیادہ حساسیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ نمونے کے طور پر درج ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

امام خمینی کے دفتر کے ایک اہل کار نے لکھا ہے: ایک بار مالی امور کے انچارج نے ایک لفافے کی پشت پر کچھ تحریر کر کے امام خمینی کی خدمت میں بھیجا۔ امام نے ایک چھوٹے کاغذ پر اس کا جواب لکھا اور اسکے نیچے تحریر کیا کہ: آپ چاہتے تو اس چھوٹے سے کاغذ پر بھی لکھ سکتے تھے۔ اس واقعے کے بعد وہ صاحب اپنے کاغذوں کو جمع کر کے ایک تھیلی میں رکھ لیتے اور جب امام خمینی کے لئے کوئی چیز لکھنا ہوتی تو کاغذ کے ان ٹکڑوں پر لکھتے اور امام خمینی بھی اسی کاغذ کے نیچے اسکا جواب تحریر فرما دیتے۔

امام خمینی کی صاحبزادی خانم زہرا مصطفوی اپنے بچپنے کی یادیں بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ: امام خمینی کا درس ساڑھے گیارہ بجے ختم ہوتا تھا اس موقع پر آپ بیس منٹ میرے ساتھ کھیلا کرتے۔ پھر ظہر سے دس منٹ پہلے نماز کی تیاری کے لئے آتے۔ امام خمینی کھیل کود کے سامان کی خریداری کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ یہ فضول خرچی ہے۔ ہم مٹی وغیرہ سے گولیاں بنا کر ان سے کھیلتے جو کوئی ان گولیوں کا نشانہ لگاتا وہ جیت جاتا تھا۔ بیس منٹ ہم یہی سادہ سا کھیل کھیلتے تھا۔

امام خمینی کے دفتر کے ایک عہدیدار نے بتایا کہ: ہر مہینے کے آخر میں (جماران کے) ماہانہ اخراجات کی تفصیل امام خمینی کی خدمت میں پیش کرنا میری ذمے داری تھی۔ ایک روز حسب معمول میں نے اخراجات کی تفصیل امام کی خدمت میں ارسال کی۔ اس تفصیل میں امام کے گھر آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع امام کی رفت و آمد اور بجلی کے اخراجات بھی تحریر تھے۔ حساب بھیجنے کے آدھے گھنٹے بعد امام خمینی کے فرزند احمد خمینی نے مجھے فون کر کے بتایا کہ: جب سے آپ نے حساب ارسال کیا ہے امام مسلسل باغ میں ٹہل رہے ہیں اور سخت ناراض ہیں کیونکہ امام کے گھریلو

اخراجات اس ماہ (اس زمانے کے) دس ہزار تومان سے بڑھ گئے ہیں۔ لہٰذا امام فرماتے ہیں کہ: اگر میرے گھریلو اخراجات دس ہزار تومان ہو گئے ہیں تو میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔

احمد خمینی نے مجھ سے کہا: آپ دیکھئے کہ اس مہینے کونسا اضافی خرچہ ہوا ہے تا کہ میں امام کو بتا کر انہیں اطمینان دلاؤں۔

میں نے کاغذات کی جانچ پڑتال کی تو مجھے تین اضافی خرچے نظر آئے جو کسی صورت امام کے گھریلو اخراجات میں سے نہ تھے۔

۱۔ جلانے کا تیل جو امام کے گھر میں زیادہ آ گیا تھا اور جسے میں نے حسینیہ جماران کے اسٹور میں ڈلوا دیا تھا۔

۲۔ امام کے گھرانے کی آمد و رفت کے لئے استعمال ہونے والی گاڑی ڈرائیور کی غفلت سے خراب ہو گئی تھی جس کی مرمت پر اخراجات آئے تھے۔

۳۔ امام کے گھر پر فائبر کی چھت ڈلوائی گئی تھی تا کہ اوپر سے امام کے گھر کا اندرونی حصہ دکھائی نہ دے کیونکہ وہاں سے پاسدار پہرہ دیا کرتے تھے۔

میں نے ان اضافی اخراجات کی تفصیل امام کی خدمت میں بھجوائی جس کے بعد وہ مطمئن ہوئے۔

اسی ایک مثال سے ہم یہ بات جان سکتے ہیں کہ امام خمینی گھریلو اخراجات میں فضول خرچی سے کس قدر سخت پرہیز کیا کرتے تھے۔

گھرانے کی معاشی ضروریات میں سخت گیری سے پرہیز

خرچ میں اعتدال جو خدا کے ممتاز اور پسندیدہ بندوں کی ایک خصوصیت ہے دو حدوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک حد افراط ہے جو اسراف اور فضول خرچی کہلاتی ہے جس کے متعلق ہم نے ابھی گفتگو کی ہے۔ جبکہ اس کی دوسری حد تفریط ہے جسے سخت گیری یا کنجوسی کہا جاتا ہے۔

اسلام آسان دین ہے یہ دین ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان اقتصادی طور پر سختی اور دباؤ میں زندگی بسر کریں۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ مرد مسلمان محنت مشقت اور تدبیر کے

ذریعے ایک خوشحال اور پرآسائش زندگی کی ضروریات فراہم کرے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح اسراف اور فضول خرچی سے لوگوں کو روکتے تھے اسی طرح کنجوسی اور اہل وعیال کیلئے نان ونفقے میں تنگی کی بھی ممانعت فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے: ان من سعادة المراء المسلم ان یشبهه ولده' والمرة الجملاء ذات دین' والمرکب الهنی والمسکن الواسع (مسلمان آدمی کی سعادت اور خوش بختی میں سے یہ بھی ہے کہ اسکا ایسا بیٹا ہو جو نیک کاموں میں اسکی شبیہ ہو' اسکی بیوی دیندار اور خوبصورت ہو اور وہ سبک رفتار سواری اور کشادہ گھر کا مالک ہو۔ بحارالانوار از علامہ مجلسی۔ ج ۷۶۔ ص ۱۴۹) بعض روایات میں پہلے فقرے کی بجائے صالح فرزند کا ذکر ہوا ہے۔ (بحارالانوار۔ ج ۷۶۔ ص ۱۵۵)

ابولبابہ' جو یہودیوں کے سامنے حکومت اسلامی کا ایک فوجی راز افشا کر کے گناہ میں مبتلا ہوئے تھے۔ جب انہیں اپنے گناہ کا علم ہوا تو انہوں نے صدق دل سے توبہ کی۔ کچھ مدت بعد ان کی توبہ کی قبولیت کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ نازل ہوئی۔ پیغمبر اسلام نے اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے' انہیں بشارت دی تو ابولبابہ نے پیغمبر سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجئے کہ اپنی توبہ قبول ہونے کے شکرانے کے طور پر' میں اپنا آدھا مال راہ خدا میں خرچ کر دوں۔ پیغمبر نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے عرض کیا: ایک تہائی مال بخشنے کی اجازت دیجئے۔ پیغمبر نے انہیں اسکی اجات دے دی۔ (بحارالانوار۔ ج ۲۲۔ ص ۹۴)

آنحضرت نے انہیں راہ خدا میں آدھا مال خرچ کرنے کی اجازت اس لئے نہیں دی کہ کہیں اس کے نتیجے میں وہ اور ان کا گھرانہ معاشی طور پر تنگی اور سختی میں مبتلا نہ ہو جائے۔

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ: مدینے کا ایک مسلمان بستر مرگ پر تھا' اس کے چند بچے اور چھے غلام تھے۔ اس شخص نے خدا سے اجر وثواب کے حصول کے لئے' اپنی موت سے پہلے اپنے چھے کے چھے غلام آزاد کر دیئے۔ موت کے بعد مسلمانوں نے اسے غسل وکفن دے کر سپرد خاک کر دیا اور اسکے بعد اسکے غلاموں کو آزاد کرنے کا قصہ اور اب اسکے بچوں کے فقر وتنگدستی کے متعلق آنحضرت کے گوش گزار کیا۔ آنحضرت نے فرمایا: لو علمت ما دفنته مع اهل

الاسلام' ترک ولده یتکففون الناس (اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اسکا جنازہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیتا۔ کیونکہ اس نے اپنے بچوں کو مال ودولت سے محروم کر کے' انہیں دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کیلئے فقیر اور بے آسرا چھوڑ دیا ہے۔ علل الشرائع از شیخ صدوق۔ ص ۵۵۸' بحارالانوار۔ ج ۱۰۳۔ ص ۱۹۷' ۱۹۸)

یہ قصہ اخراجات میں فضول خرچی کی مذمت کے ساتھ ساتھ' اس بات کو بھی بیان کرتا ہے کہ یہ عمل اہل خانہ کے سختی اور دباؤ میں مبتلا ہو جانے کا موجب نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ ہر پہلو میں خرچ میں اعتدال اور میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے۔

بصرہ سے تعلق رکھنے والے ایک شیعہ "عاصم" پر حضرت علی علیہ السلام کی شدید تنقید کا قصہ بھی' ضروریات زندگی میں سخت گیری اور اقتصادی تنگی کی مذمت پر واضح دلیل ہے۔ عاصم نے معاشرے سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا' جس کے نتیجے میں وہ اور اسکے اہل خانہ معاشی تنگی کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ قصہ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۲۰۷ میں آیا ہے۔ (۱)

اس گفتگو کو ہم درج ذیل دلچسپ قصے پر ختم کرتے ہیں: امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے

۱۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ: حضرت علی کے ایک صحابی "علاء ابن زیاد حارثی" نے امام سے کہا کہ مجھے اپنے بھائی "عاصم ابن زیاد" کی آپ سے شکایت کرنی ہے۔ امام نے فرمایا: کیوں' اسے کیا ہوا ہے؟ علاء نے کہا: اس نے ایک چادر اوڑھ لی ہے' اور دنیا کو یکسر ترک کر دیا ہے۔ امام نے فرمایا کہ اسے میرے پاس لاؤ۔ جب عاصم کو لایا گیا تو امام نے اس سے فرمایا: اے اپنی جان کے دشمن! شیطان خبیث نے تمہیں بھٹکا دیا ہے۔ تمہیں اپنی آل اولاد پر رحم نہیں آتا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ نے جن پاکیزہ چیزوں کو تمہارے لئے حلال کیا ہے اگر تم انہیں کھاؤ پیو اور استعمال کرو گے تو اسے ناگوار گزرے گا۔ تم اللہ کی نظروں میں اس سے کہیں زیادہ پست ہو کہ وہ تمہارے لئے یہ چاہے۔ اس نے کہا کہ یا امیر المومنین! آپ بھی تو معمولی لباس اور روکھے پھیکے کھانے پر گزارا کرتے ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا: تم پر حیف ہے کہ تم اپنا موازنہ میرے ساتھ کر رہے ہو' خدا نے ائمہ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو مفلس ونادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تا کہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ وتاب نہ کھائے۔

اپنے آزاد کردہ ایک غلام کے لئے گھر خریدا' اور اس سے فرمایا کہ: اس گھر میں جاؤ اور وہاں زندگی بسر کرو۔ کیونکہ تمہارا (موجودہ) گھر تنگ اور چھوٹا ہے۔

غلام نے کہا: مولا! تنگ اور مختصر ہونے کے باوجود میرے لئے یہی گھر کافی اور اچھا ہے۔ کیونکہ یہ میرے والد کی یادگار ہے۔ لہٰذا میں اسی گھر میں رہوں گا۔

امام نے اس سے فرمایا: ان کان ابوک احمق ینبغی ان تکون مثلہ (اگر تمہارے والد نے غلطی کی تھی تو کیا درست ہوگا کہ تم بھی انہی کی مانند کرو؟ (محاسن برقی۔ ص ۶۱۱۔ بحار الانوار۔ ج ۷۶۔ ص ۱۵۳)

ہر طرح کے شرک سے پرہیز

سورۂ فرقان میں خداوند رحمٰن کے خاص اور ممتاز بندوں کی چھٹی خصوصیت' ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ: وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ (اور وہ لوگ خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۸) یعنی یہ لوگ خالص توحید کی صراطِ مستقیم پر ہیں اور ہر قسم کے شرک اور شرک آلود عبادات سے پرہیز کرتے ہیں۔

تمام انبیائے کرام نے اپنی دعوت کا آغاز' لوگوں کو توحید کی طرف بلانے اور ہر قسم کے شرک کی نفی سے کیا ہے۔ توحید' آسمانی ادیان کی عظیم الشان عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔ انبیا کی زیادہ تر جدوجہد مشرکین کے خلاف اور ان کی سرنگونی کے لئے رہی' اور ان مقدس حضرات نے اس راہ میں کٹھن مشکلات کا سامنا کیا۔ انہوں نے اپنی آخری سانس تک شرک اور مشرکین کے خلاف جنگ لڑی' اور ان کا اصل اور حقیقی مقصد توحید کی بنیاد پر ایک انسانی معاشرے کی تشکیل تھا۔

توحید کی مختلف اقسام کی مانند' شرک کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ انبیا' آسمانی کتب اور ائمۂ معصومین نے لوگوں کے سامنے توحید کی تمام اقسام کو واضح کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے شرک کی مختلف شاخوں کی بھی وضاحت کی ہے اور لوگوں سے تقاضا اور مطالبہ کیا ہے کہ وہ توحید کے سیدھے راستے پر چلیں' ایک ایسا راستہ جو ہر قسم کے شرک سے پاک اور دور ہے۔

اگرچہ انبیا کے زمانے میں زندگی بسر کرنے والے لوگ شرک کی مختلف اقسام سے آلودہ تھے' لیکن اکثر لوگ ''عبادت میں شرک'' کے شکار تھے اور خدائے واحد کی پرستش وعبادت کی بجائے' دوسری اشیا' جیسے طرح طرح کے بتوں' سورج' چاند اور ستاروں کی پرستش میں مصروف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا کی اکثر جدوجہد اس قسم کے شرک کے خلاف رہی۔

زیر بحث آیت (سورۂ فرقان کی آیت ۶۸) میں اگرچہ ہر قسم کے شرک کی نفی کی گئی ہے لیکن اس میں بھی زیادہ تر ''عبادت میں توحید'' کا مسئلہ پیش نظر ہے۔ کیونکہ عبادت میں خالص اور کامل توحید ہر قسم کے شرک سے پرہیز کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا آیت کہہ رہی ہے کہ: خداوند رحمٰن کے خاص بندوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ لوگ خالص توحید پرست ہیں۔ کسی بھی صورت میں' بالخصوص عبادت میں' کسی کو خدا کا شریک اور ہم سر نہیں سمجھتے۔ ہر قسم کے جلی وخفی شرک اور شرک آلود امور سے اجتناب کرتے ہیں۔ نورِ توحید کی کرنوں سے ان کا قلب منور ہے' اور چشمۂ توحید کے خالص اور شفاف پانی نے ان کی روح کو شرک کی غلاظتوں سے پاک کیا ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر' یہ لوگ توحید میں ڈوبے ہوئے ہیں' اور ان میں ذرّہ برابر بھی شرک نہیں پایا جاتا۔

قرآنِ مجید میں دوسو سے زیادہ مرتبہ' شرک اور بت پرستی کی ممانعت اور غیر توحیدی رجحانات کی نفی اور انکار کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ چھتیس مرتبہ ''مشرکین'' کے لفظ کے ساتھ' مشرکوں کو سرزنش کی گئی ہے اور اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ خداوند عالم کا شدید اور سخت عذاب ان کا منتظر ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ توبہ کے آغاز میں ارشادِ الٰہی ہے: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (جن مشرکین سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا' اب ان سے خدا اور رسول کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱)

اسی سورے میں ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ (مشرکین نجس اور ناپاک ہیں' پس مسجد الحرام کے نزدیک نہ آئیں۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۲۸)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (اور جو بھی

اللہ کا شریک بنائے گا' وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۴۸)

نیز فرمانِ الٰہی ہے: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (اور جو خدا کا شریک قرار دے گا' وہ گمراہی میں بہت دور تک چلا گیا ہے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۱۶)

اسی طرح حضرت لقمان کی زبانی ان کے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (اے بیٹا! خبردار کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۳)

قرآنِ کریم میں مشرکین کی مثالیں

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر مفاہیم ونکات کی وضاحت کے لئے مثالوں سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ مثال حسی اور قابلِ محسوس امور کے ذریعے عقلی حقائق کی تشبیہ کا نام ہے' جس کے ذریعے بلند عقلی مفاہیم کو سننے والے آسانی اور گہرائی کے ساتھ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس بنا پر قرآنِ کریم میں اہم ترین مفاہیم کو (پچاس سے زیادہ) مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ انہی میں وہ مثالیں بھی شامل ہیں جو شرک اور مشرکین کے بارے میں قرآنِ کریم میں ذکر ہوئی ہیں اور جو شرک کے گناہ اور مشرکین کی نجاست اور آلودگی کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں۔ اس حوالے سے قرآنِ کریم میں ذکر ہونے والی چند مثالیں آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔

''مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ .''

''جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا' ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے طوفان کے دن کی تیز ہوا اڑا لے جائے' کہ وہ اپنے حاصل کئے ہوئے پر بھی کوئی اختیار نہ رکھ سکیں گے۔'' (سورۂ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۱۸)

بے شک مشرکین کفار ہی میں سے ہیں' لہٰذا ان کے اعمال' حتیٰ ان کے نیک اعمال ایسے کھوکھلے اور بے مغز ہیں جو راکھ کی حیثیت رکھتے ہیں' جسے شدید طوفانی ہوائیں اڑا لے جاتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر' مشرکین اپنے اعمال اور ان کے نتائج سے محروم رہتے ہیں' یہاں تک کہ کچھ

اور بہت کم اعمال اوران کے نتائج کو بھی اپنے لئے ذخیرۂ آخرت نہیں بنا سکتے۔ شرک اور کفر کا شدید طوفان کفار اور مشرکین کے نیک اعمال کو اس طرح بہا لے جاتا ہے' جیسے شدید طوفانی ہوائیں' خاک کے ذرّوں کو اڑا لے جاتی ہیں۔

" وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ."

''اور اللہ نے ایک اور مثال ان دو (مومن اور مشرک) انسانوں کی بیان کی ہے جن میں سے ایک پیدائشی گونگا ہے اور کسی کام کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ خود اپنے آقا کے سر پر ایک بوجھ ہے کہ وہ اسے جس کام کے لئے بھی بھیجتا ہے اسے اچھی طرح انجام نہیں دیتا۔ تو کیا ایسا انسان اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو عدل کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر گامزن ہے۔'' (سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۷۶)

اس مثال میں خداوند عالم مشرکین کو درج ذیل پانچ خصلتوں کے حامل افراد قرار دیتا ہے:

۱۔ یہ غلام اور بے اختیار ہیں۔

۲۔ یہ گونگے اور بہرے ہیں۔

۳۔ یہ کسی کام کے قابل نہیں۔

۴۔ یہ اپنے آقا اور مالک کے سر پر بوجھ ہیں۔

۵۔ یہ ہر کام میں شکست خوردہ اور ناکام و نامراد رہتے ہیں۔

لیکن مومنین' جو ہر طرح کے شرک سے دور رہتے ہیں' ان میں نہ صرف مذکورہ ناپسندیدہ صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی بلکہ وہ ہمیشہ عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے ہیں۔

لہٰذا کیا مومن اور مشرک برابر ہو سکتے ہیں؟

بے شک یہ برابر نہیں ہو سکتے۔

" وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ."

''اور کسی طرح کا شرک اختیار نہ کرو' کہ جو کسی کو خدا کا شریک بناتا ہے وہ گویا آسمان سے گر پڑتا ہے اور اسے پرندہ اچک لیتا ہے' یا اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر لے جا کے پھینک دیتی ہے۔'' (سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۱)

اس مثال میں انتہائی وضاحت کے ساتھ مشرکین کی بے چارگی اور ان کے وحشت ناک زوال و نابودی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مشرکین اس قدر بے چارے ہیں کہ پہلے تو انہیں ان کے شرک کی وجہ سے آسمان سے زمین کی طرف پھینکا جاتا ہے اور پھر وہ درمیان میں لاش خور پرندوں کی غذا بنتے ہیں اور اس کے بعد اگر ان پرندوں کے ہاتھوں سے بچ جاتے ہیں تو ہولناک طوفان کا شکار بنتے ہیں اور آخر کار یہ طوفان انہیں ایک ایسی جگہ زمین پر پٹخ دیتا ہے جہاں کوئی ان کا مونس و مددگار اور نجات دہندہ نہیں ہوتا۔ اس موقع پر ان کا بدن چورہ چورہ ہو جاتا ہے اور اس کا ذرّہ ذرّہ بکھر کے رہ جاتا ہے۔

ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ آسمانِ توحید سے جدا ہو کر شرک کی ہولناک گھاٹی میں جا پڑے ہیں' اور بے رحم شیطان کے طوفان نے انہیں اچک کر دور دراز مقام پر اٹھا پھینکا ہے اور انہیں بکھیر کے رکھ دیا ہے۔

" مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ."

''اور جن لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لئے ہیں' ان کی مثال مکڑی جیسی ہے کہ اس نے گھر تو بنا لیا ہے' لیکن سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے' اگر ان لوگوں کے پاس علم و ادراک ہو۔'' (سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۴۱)

سب جانتے ہیں کہ مکڑی کا گھر انتہائی نازک اور کمزور ہوتا ہے۔ نہ اس میں در و دیوار

ہوتے ہیں' نہ کھڑکی اور چھت۔ اسے انتہائی نازک اور باریک تاروں سے بنایا گیا ہوتا ہے۔ لہٰذا جوں ہی ہلکی سی بھی ہوا چلے' اسکے تاروپود بکھر کے رہ جاتے ہیں۔

اسے ملیامیٹ کردینے کے لئے بارش کے چند قطرے ہی کافی ہوتے ہیں۔

آگ کا معمولی سا شعلہ بھی اسے نابود کردینے کے لئے بہت ہوتا ہے۔

جھاڑو کا ہلکا سا اشارہ ہی اسے زیروزبر کردیتا ہے' اس میں بقا کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی' اپنی بقا کے لئے سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔

خداوند عالم نے مذکورہ آیت میں مشرکین کے مسکن کو مکڑی کے کمزور گھر سے تشبیہ دی ہے' جس کی کمزوری اور بے وقعتی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

مذکورہ بالا چار مثالوں میں' انتہائی وضاحت کے ساتھ' شرک کے بدصورت باطن اور مشرکین کی کمزوری اور ضعف کو ہمارے لئے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثالیں صاف وصریح الفاظ میں ہم سے کہتی ہیں کہ طاغوت اور باطل معبود خواہ ظاہراً دلکش اور دلربا نظر آتے ہوں لیکن اندر سے خالی اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف کسی بھی طرح نجات دہندہ نہیں ہوسکتے بلکہ کمال وارتقا کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور انسان کو گمراہی کے راستوں پر ڈال کر اسے بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں۔ مکڑی کے گھر کے کمزور تار انسانوں کو کبھی بھی گمراہی کے ہولناک گڑھے سے نہیں نکال سکتے' صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی مشرکین کی زندگی ایسی ہی ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر ہو گی۔ قرآن کریم کہتا ہے: لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد کردیئے جائیں گے اور تمہارا شمار گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوجائے گا۔ سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۶۵)

شرک کے معنی کی وسعت اور اسکے مختلف پہلو

اگر کوئی انسان شرک سے بچنا چاہتا ہے' تو اسکے لئے لازم ہے کہ وہ شرک کی تمام اقسام سے واقف ہو۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم شرک اور توحید کی تمام علامات اور اقسام سے باخبر ہوں' تاکہ ہر قسم کے شرک سے مکمل طور پر دور رہ سکیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک قول ہے: اِنَّ بَنِی اُمَیَّۃَ اَطْلَقُوا لِلنَّاسِ تَعْلِیْمَ الْاِیْمَانِ وَلَمْ یُطْلِقُوا تَعْلِیْمَ الشِّرْکِ ' لِکَیْ اِذَا حَمَلُوْ ھُمْ عَلَیْهِ لَمْ یَعْرِفُوْہ (بنی امیہ نے لوگوں کو ایمان کی تعلیم کیلئے آزاد چھوڑا لیکن انہیں (وسیع معنی میں) شرک کے متعلق جاننے کی آزادی نہیں دی۔ تاکہ جب وہ انہیں شرک کی طرف لیجانا چاہیں تو لوگ جان نہ سکیں۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۱۵' ۴۱۶)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر بنی امیہ لوگوں کو شرک کے وسیع معنی جاننے کی آزادی فراہم کرتے' تو لوگ جان لیتے کہ خداوند عالم کے فرمان کو چھوڑ کر غاصب حکمرانوں کی اطاعت و پیروی بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ اس طرح نتیجے کے طور پر یہ علم انہیں ظالم خلفا کی اطاعت سے باز رکھتا۔

ایک شخص نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا: وہ کم سے کم چیز کیا ہے جس کے ارتکاب سے انسان مشرک ہوجاتا ہے؟ امام نے جواب دیا: مَنْ قَالَ لِلنَّوَاۃِ اِنَّھَا حَصَاۃٌ وَلِلْحَصَاۃِ اِنَّھَا نَوَاۃٌ ثُمَّ دَانَ بِهِ (جو کوئی گٹھلی کو کہے کہ کنکر ہے اور کنکر کو کہے کہ گٹھلی ہے اور پھر اسی کو اپنا دین اور عقیدہ بنالے۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۱۵' ۴۱۶)

عارف اور محقق عالم "فیض کاشانی" نے اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: اگر کوئی اپنے دل سے اس بات کا معتقد ہوجائے اور اسی کو اپنا دین بنالے' تو وہ مشرک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس شخص کا یہ عمل اسکی نفسانی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ عقیدہ رکھنے والا شخص اگرچہ خدا کی عبادت و پرستش کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی نفسانی خواہش کی اطاعت بھی کرتا ہے اور نتیجے کے طور پر اس نے (اپنی خواہش کو) اطاعت میں خدا کا شریک قرار دیا ہوا ہے۔ اصولِ کافی (مترجمہ فارسی)۔ ج ۴۔ ص ۱۱۳)

دوسری طرف رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ اصغی الی ناطق فَقَد عبدہٗ فَاِنْ کَانَ النَّاطِقُ عَنِ اللّٰہِ عزوجلَ فَقَدْ عَبَدَاللّٰہ ' وَاِنْ کَانَ النَّاطِقُ عَنْ اِبْلِیْسَ ' فَقَدْ عَبَدَ اِبْلِیْسَ (ایسا شخص جو کسی خطیب کی بات (اس کی گفتگو کی سچائی پر عقیدے کے ساتھ)

سنے اس نے اس خطیب کی عبادت کی ہے۔ پس اگر وہ خطیب خدا کی طرف سے بول رہا ہو تو اسے سننے والے نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر وہ شیطان کی طرف سے بول رہا ہو تو اسے سننے والے نے شیطان کی پرستش کی ہے۔ بحارالانوار۔ ج ۲۶۔ ص ۲۳۹)

اس قسم کی روایات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شرک انتہائی وسیع معنی کا حامل مفہوم ہے۔ مومنِ کامل اور خالص توحید پرست شخص وہ ہے جو شرک کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہو اور ان سے اجتناب کرتا ہو ورنہ وہ بھی غیر شعوری طور پر شرک کی وادی میں اتر جائے گا۔

اس حوالے سے ایک دوسری بات یہ ہے کہ ائمۂ معصومین کی روایات کے مطابق شرک کی دو قسمیں ہیں: ایک شرکِ جلی (یعنی آشکارا' کھلا اور ظاہر شرک) اور دوسری شرکِ خفی (یعنی چھپا ہوا اور نہاں شرک)

بت پرستی اور ایک سے زیادہ معبودوں کی پرستش وغیرہ شرکِ جلی میں سے ہیں جبکہ عبادت واطاعتِ الٰہی میں خودنمائی اور ریاکاری شرکِ خفی میں سے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: شرک' اون سے بنے سیاہ لباس پر' تاریک رات میں چیونٹی کے رینگنے سے زیادہ خفیہ اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسکی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان خدا سے طلبِ حاجت کے لئے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو گھمائے۔

نیز آپ ہی نے فرمایا ہے: شرک' سیاہ رات میں' سیاہ ٹاٹ پر چیونٹی کے رینگنے سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے' جیسے یہ کہ انسان خدا کے علاوہ کسی اور کے لئے نماز پڑھے' یا قربانی دے یا اس سے دعا مانگے۔ (بحارالانوار۔ ج ۷۲۔ ص ۹۶)

لہٰذا' عبادت اور اطاعتِ الٰہی میں ہر قسم کی ریاکاری اور خودنمائی' شرک کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ توحید اور صحیح عبادت و پرستش کی شرائط میں سے ایک شرط اخلاص ہے۔ اسی بنیاد پر اولیاءاللہ اور خدا کے نیک اور برگزیدہ بندے اس بات کی طرف سے انتہائی ہوشیار محتاط اور چوکس رہا کرتے تھے کہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اخلاص کی حدوں سے باہر نہ نکلنے پائیں اور خدانخواستہ کہیں شرک کے کسی غیر محسوس پہلو کا شکار نہ ہو جائیں۔

نقل کرتے ہیں کہ جب امام خمینی علیہ الرحمہ نجف اشرف میں ہوا کرتے تھے' تو بعض طلبا نے آپ کو پیغام بھجوایا کہ آپ کا عمامہ اور داڑھی چھوٹی ہے' ایک مرجع تقلید کے شایانِ شان نہیں۔ امام خمینی نے ان کے جواب میں فرمایا: ان سے کہو کہ میں ابھی مشرک نہیں ہوا ہوں۔

یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ خودنمائی کی غرض سے عمامہ اور داڑھی کا بڑا کرنا بھی' شرک کی ایک قسم ہے۔ (برداشتھائی از سیرت امام خمینیؒ۔ ج ۱۔ ص ۳۲۴' پابہ پائے آفتاب۔ ج ۴۔ ص ۴۸)

شرک کا دامن اس قدر وسیع و عریض ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بقول: اگر کوئی مومن تمام عبادات انجام دے لیکن ایک چیز جسے خدا یا اسکے رسول نے معین کیا ہے اسکے بارے میں کہے کہ: کیوں (خدا نے) اس کے برخلاف چیز معین نہیں کی' یا اس کے باطن میں ایسی حالت پیدا ہو جائے تو ایسا شخص بغیر زبانی اظہار کے شرک میں گرفتار ہو گیا ہے۔ (اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۳۹۸)

نیز آپ ہی کا ارشاد ہے: اگر کوئی کہے کہ: اگر فلاں (شخص) نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا' یا مجھے نقصان اٹھانا پڑتا' یا میں اپنی مراد حاصل نہ کر پاتا اور اسی طرح کی دوسری باتیں کرے' تو ایسے شخص نے مالکیت اور رازقیت میں (اس فلاں شخص کو) خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ پس اگر ایسے مواقع پر وہ یہ کہے کہ: اگر خداوند عالم فلاں شخص کو میری مدد کے لئے نہ بھیجتا تو میں ہلاک ہو جاتا' یا اپنا مقصود حاصل نہ کر پاتا' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (بحارالانوار۔ ج ۷۲۔ ص ۱۰۰)

نیز روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا مومن جو ایک مالدار کے یہاں جائے' اور اسکی دولت کی خاطر اسے سلام کرے' اور اسکے سامنے انکساری اور عاجزی کا مظاہرہ کرے' تو وہ اپنے دو تہائی دین سے محروم ہو جاتا ہے۔ (بحارالانوار۔ ج ۷۳۔ ص ۱۶۹)

ہم اس موضوع پر گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے اسے توحید اور شرک کے مختلف پہلوؤں کے ذکر پر ختم کر رہے ہیں۔

اسلامی فلاسفہ اور علمائے علمِ کلام کہتے ہیں کہ: توحید کی متعدد شاخیں ہیں۔ جیسے توحیدِ ذات' توحیدِ صفات' توحیدِ عبادی' توحیدِ افعالی جو مختلف اقسام پر مشتمل ہے' جیسے خالقیت میں توحید' ربوبیت

میں توحید، مالکیت میں توحید، تکوینی وتشریعی حاکمیت میں توحید۔ اسی طرح توحید کی ضد یعنی شرک کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ اوران میں سے کسی ایک قسم میں بھی کسی کا گرفتار ہو جانا' اس انسان کو مشرک بنانے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا شرک بھی وسیع معنی رکھتا ہے۔

خدا اپنے ممتاز اور خاص بندوں میں ایک صفت یہ بھی دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ شرک کے تمام پہلوؤں اور اسکی تمام اقسام سے باخبر ہوں اور ہر قسم کے شرک سے دور رہیں تاکہ وہ فکر' عقیدے اور عمل میں توحید کی پاک و پاکیزہ راہ پر گامزن ہو سکیں۔ یقیناً اگر تمام پہلوؤں میں ان کی توحید درست ہو جائے تو وہ ہر میدان میں اسکے خوبصورت معنوی آثار کا مشاہدہ کریں گے اور مطلوبہ نتائج حاصل کریں گے۔

توحید کی اہمیت اور شرک کی ناپسندیدگی

اس گفتگو کو مکمل کرنے کی غرض سے توحید کی اہمیت اور شرک کی ناپسندیدگی کے بارے میں چند احادیث کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

شریح بن ہانی سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: جنگ جمل کے دوران' ایک عرب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: اے امیر المومنین! کیا آپ خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں؟ وہاں موجود جو لوگ اس شخص کی یہ بات سن رہے تھے انہوں نے اس پر چڑھائی کر دی اور کہا: اے بدو! کیا تجھے نظر نہیں آرہا کہ اس وقت امیر المومنین کا ذہن دوسرے مسائل کی جانب متوجہ ہے (ہر بات کا ایک وقت ہوا کرتا ہے کیا یہ اس قسم کے سوالات کا موقع ہے؟)

یہ دیکھ کر امیر المومنین نے ان لوگوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا: **دَعُوهُ فَاِنَّ الَّذی یُریدُهُ الاعرابیُّ هُوَالَّذی نُریدُهُ مِنَ القوم** (اسے کچھ نہ کہو، یہ بدو جس چیز کے بارے میں ہم سے سوال کر رہا ہے وہ وہی چیز ہے جو ہم اس دشمن جماعت سے چاہتے ہیں (اور اسکی خاطر ان کے خلاف مصروف جنگ ہیں)

پھر آپ نے فرمایا: اے اعرابی! ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خدا واحد ہے' تو اسکے چار معنی ہیں' ان میں سے دو معنی خدا کے بارے میں روا نہیں ہیں اور دو معنی (اسکے بارے میں) ثابت و مسلم ہیں۔

جو دو معنی روا نہیں (وہ درج ذیل ہیں)

۱۔ کوئی شخص کہے کہ خدا واحد ہے اور اسکا مقصد "واحدِ عددی" ہو۔ کیونکہ جس چیز کا دوسرا نہیں ہوتا وہ اعداد کی فہرست میں نہیں آتی اور اسکے بارے میں ایک اور دو نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ اور اسی طرح اگر کوئی کہے کہ خدا واحد ہے اور اس کی مراد جنس میں سے واحدِ نوعی ہو تو یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ اسکا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کی شبیہ موجود ہے۔

اب رہے توحید کے وہ دو معنی جو خدا کے لئے روا اور ثابت ہیں' تو ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ یکتا ہے۔ لہٰذا اسکی کوئی شبیہ اور مثل موجود نہیں۔ دوسرے یہ کہ: وہ "احدی المعنی" ہے۔ یعنی اسکی ذات ناقابلِ تقسیم ہے' نہ خارجی وجود میں' نہ ہی عقل میں اور نہ وہم و تصور میں (بلکہ اسکی ذات بسیط معنی ہے)۔ (بحار الانوار۔ ج ۳۔ ص ۲۶)

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے ایک صحابی ابن مسعود سے فرمایا: **اِیّاکَ اَنْ تُشرِکَ بِاللهِ طَرفَةَ عَینٍ' وَاِنْ نُشِرْتَ بِالمِنشارِ اَوْ قُطِّعْتَ اَوْ صُلِبْتَ اَوْ اُحرِقْتَ بِالنّارِ** (پلک جھپکنے کے عرصے کے لئے بھی خدا کا شریک قرار دینے سے پرہیز کرو۔ چاہے تمہیں آرے سے چیر کے رکھ دیا جائے' یا تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے' یا سولی پر چڑھا دیا جائے' یا آگ میں جلا دیا جائے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۰۷)

انسانی قتل اور ایذا رسانی سے اجتناب

قرآنِ مجید' خداوند عالم کے خاص اور ممتاز بندوں کی ساتویں صفت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (اور وہ کسی بھی نفس کو' جسے خدا نے محترم قرار دیا ہے' ناحق قتل نہیں کرتے۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۸)

کسی انسان کا ناحق خون بہانا بڑے اور خطرناک گناہوں میں شامل ہے' لیکن اس کے باوجود انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ قدیم زمانے ہی سے انسان اس گناہ میں مبتلا رہا ہے' اور اس نے بکثرت انسانوں کو برباد کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا ایک بیٹا ''قابیل'' تا قیامِ قیامت لعنت ملامت کا مستحق رہے گا کیونکہ اس نے اپنے بھائی ''ہابیل'' کو قتل کر کے اس گناہ کی ابتدا کی۔

انسانی قتل اس قدر گھناؤنا اور ناپسندیدہ عمل سمجھا جاتا ہے کہ جب خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت اور اپنے خلیفہ اور نمائندے کی حیثیت سے فرشتوں کے سامنے ان کے تعارف کا فیصلہ کیا' تو ملائکہ نے عرض کیا: پروردگار! کیا زمین پر اسے بھیجے گا جو وہاں فساد اور خونریزی برپا کرے گا؟ اس پر خداوند عالم نے فرشتوں کو حضرت آدم کے مثبت پہلوؤں (یعنی علم و معرفت) سے روشناس کرایا۔ یہ جاننے کے بعد فرشتوں نے اللہ سے معذرت طلب کی۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰ تا ۳۲ کا خلاصہ)

انسانی قتل انتہائی بڑا گناہ ہے اور اسکے لئے سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ خداوند عالم قرآنِ مجید میں فرماتا ہے کہ: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (اور جو بھی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اسکی سزا جہنم ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اُس پر خدا کا غضب بھی ہے اور خدا اُس پر لعنت بھی کرتا ہے اور اُس کے لئے سخت عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۹۳)

اس آیت میں قاتل کے لئے چار سخت سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا ٹھکانہ دوزخ رہے گا' دوسرا یہ کہ وہ خدا کے غضب اور ناراضگی کا نشانہ بنے گا' تیسرا یہ کہ اس پر خدا کی لعنت پڑے گی اور چوتھا یہ کہ اُسے خدا کے سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (جس شخص نے کسی نفس کو کسی نفس کے بدلے یا روئے زمین پر فساد کی سزا کے علاوہ قتل کیا' گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کیا ہے۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۳۲)

اسلام نے قاتل کی دنیاوی سزا یہ مقرر کی ہے کہ قصاص کے طور پر خود اسے بھی سولی پر چڑھا دیا جائے۔ البتہ اگر مقتول کے ورثاء اسے معاف کر دیں اور اسکے عوض دیت وصول کر لیں یا دیت بھی معاف کر دیں تو وہ اس سزا سے بچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قتل کے سخت گناہ سے اسے چھٹکارا نہیں مل سکے گا۔

کبھی کبھی ورثاء کا معاف کر دینا بھی بے سود رہتا ہے اور قاتل کو لازماً سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ شخص شر پسندوں میں سے ہو اور سرد یا گرم اسلحہ کے زور پر لوگوں میں خوف و ہراس پھیلاتا اور معاشرے کے امن و امان کو خطرے میں ڈالتا ہو۔ ایسے فرد کو ''محارب اور مفسد فی الارض'' کہا گیا ہے اور حکومتِ اسلامی اسے موت کی سزا دیتی ہے۔ اس بارے میں قرآنِ کریم میں ہے کہ: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ

يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِى الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (بس خدا اور اسکے رسول سے جنگ کرنے والوں اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کی یہی سزا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے' یا سولی پر چڑھا دیا جائے' یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں' یا انہیں ارضِ وطن سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں سخت عذاب ہے۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۳۳)

اس آیت کے ذریعے بھی انسانی قتل کے گناہ کی شدت واضح ہوتی ہے' جو سخت سزاؤں کا موجب اور دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔

انسان کے قاتلوں کے لئے قصاص اور دیت کی شدید سزائیں

معاشرے میں امن و امان ایک اہم ترین نعمت ہے جس کے زیرِ سایہ ایک صحت مند اور آئیڈیل معاشرہ تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اسکے برعکس امن و امان کا فقدان فتنہ و فساد' برائیوں اور طرح طرح کی آفات کا باعث ہے۔ لہٰذا اسلام نے محکم اور سخت قوانین بنا کر معاشرے کے مختلف شعبوں میں امن و امان کے تحفظ کی کوشش کی ہے۔ پہلے مرحلے میں اسلام نے جان کی سلامتی پر زور دیا ہے اور امن و امان درہم برہم کرنے والے لوگوں کے لئے (اُخروی عذاب کے علاوہ) دنیوی سزائیں بھی تجویز کی ہیں۔ مثلاً قصاص کا قانون مقرر کیا ہے' جس پر اگر واقعی عمل ہو تو انسانی قتل اور انہیں ہر قسم کا نقصان پہنچانے کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ قصاص اور حدود و دیات کا نفاذ معاشرے میں ایک پُرسکون اور سالم و صحت مند زندگی کی ضمانت فراہم کرے گا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید کہتا ہے کہ: وَ لَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (صاحبانِ عقل تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے' شاید تم اس طرح متقی بن جاؤ۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۷۹)

یعنی قصاص' انفرادی طور پر کسی سے انتقام لینے کا نام نہیں' بلکہ یہ قانون آسودہ زندگی اور معاشرتی امن و سکون کا ضامن ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں انسانوں کے قاتل سے قصاص نہ لیا جائے ایک مردہ معاشرہ ہے۔ جس طرح علمِ طب' زراعت اور ڈیری فارمنگ میں مویشیوں کی نگہداشت کے دوران خطرناک جراثیم کو ختم کرنا ایک علمی اصول ہے' اسی طرح معاشرتی و سماجی علم

میں جرائم پیشہ اور انسانوں کو قتل اور انہیں نقصان پہنچانے والے افراد کا قلع قمع کرنا ایک عقلی اور منطقی امر ہے۔

قصاص کا قانون عدل و انصاف کا ضامن اور زندگی و سکون کا باعث ہے اور معاشرے سے اضطراب' کشیدگی اور بے چینی کے خاتمے میں ایک موثر کردار کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے مذکورہ آیت میں قصاص کو تقویٰ کا موجب قرار دیا ہے۔ یعنی قصاص' قتل و غارت گری کی روک تھام اور انسانوں کی جان و مال' عزت و آبرو کو نقصان سے بچانے کا باعث ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ فرد اور معاشرے کا تقابل کیا جائے' تو معاشرے کو فرد پر تقدم اور فوقیت حاصل ہے۔

قتل کے علاوہ' انسانی بدن کو نقصان پہنچانے کا بھی قصاص ہے۔ اگر کوئی کسی انسان کے ناک' کان' آنکھ' دانت' مختصر یہ ہے کہ اسکے بدن کے کسی بھی عضو کو نقصان پہنچائے' تو جسے نقصان پہنچا ہے' اسے قانونی طور پر حق حاصل ہے کہ جس قدر اسے نقصان پہنچا ہے' اسی قدر نقصان پہنچانے والے سے اس کا قصاص لے۔ اس بارے میں سورۂ مائدہ کی ایک آیت ہے کہ: وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَ الْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوحَ قِصَاصٌ (اور ہم نے اس میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جان کا بدلہ جان اور آنکھ کا بدلہ آنکھ اور ناک کا بدلہ ناک اور کان کا بدلہ کان اور دانت کا بدلہ دانت ہے اور زخموں کا بھی بدلہ لیا جائے گا۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۴۵)

قانونِ قصاص' جسے اسلام نے انتہائی تفصیل اور جزیات کے ساتھ بیان کیا ہے' یہ قانون اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام کی نظر میں انسانی جان کو بہت زیادہ احترام حاصل ہے اور اس نے قانونِ قصاص مقرر کر کے چاہا ہے کہ انسانی جان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے۔

پس قانونِ قصاص' قانونِ حدود و دیات ہے جو خود اپنی جگہ سہواً اور بھول چوک سے بھی انسانوں کی جان اور معاشرتی امن و سکون کی حفاظت کا ایک طاقت ور عامل ہے۔

سہواً اور غلطی سے سرزد ہونے والا ہر گناہ' توبہ کے ذریعے معاف ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی

بھولے سے اور نادانستگی میں کسی انسان کو قتل کر دے' یا انسانی بدن کے کسی عضو کو نقصان پہنچا بیٹھے' تو اسکی دیت ہے اور یہ حقوق العباد میں سے ہے جنہیں ادا کئے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی۔

دیت کے مسائل نہایت تفصیلی ہیں' جنہیں بیان کرنے کی اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں لیکن ہم یہاں مثال کے طور پر چند مسائل کا ذکر کر کے اسلام کی نظر میں انسانی جان کے احترام کی اہمیت جان سکتے ہیں۔ مثلاً چند چیزیں ایسی ہیں جن کی دیت اتنی ہی ہے جتنی ایک انسان کو قتل کرنے کی دیت ہوتی ہے۔

مکمل دیت ایک ہزار مثقال سونا' یا سو اونٹ یا دو سو گائیں ہے۔ اگر کوئی کسی مسلمان کے کان پر مارے اور اسکی وجہ سے وہ شخص بہرا ہو جائے' تو مارنے والے کو مکمل دیت کی آدھی دیت ادا کرنی چاہئے اور اگر کسی کے دونوں کانوں پر مارے اور دونوں کو بہرا کر دے' تو اسے مکمل دیت ادا کرنی چاہئے۔

حد یہ ہے کہ اگر والدین یا اساتذہ اپنے بچے یا شاگرد کو اس قدر زدوکوب کریں کہ اُن پر اسکی دیت واجب ہو جائے' تو یہ سخت گناہ ہے۔

اگر کوئی کسی دوسرے کے منہ پر تمانچہ مارے' اور اسکے نتیجے میں تمانچہ کھانے والے کا چہرہ سرخ ہو جائے' تو مارنے والے پر ڈیڑھ مثقال سونا' یا اسکی قیمت کے برابر دیت کی ادائیگی واجب ہوگی۔ اگر اس کا چہرہ نیلا پڑ جائے' تو تین مثقال اور اگر سیاہ پڑ جائے' تو چھے مثقال یا اسکی برابر قیمت اسکی دیت ہے۔ اور اگر چہرے کے سوا جسم کے کسی اور حصے پر مارے' جس کی وجہ سے وہ حصہ سرخ' نیلا یا سیاہ پڑ جائے' تو چہرے کے بارے میں جس دیت کو بیان کیا گیا ہے مارنے والے پر اسکی نصف دیت ادا کرنا اور اس شخص کو راضی کرنا ضروری ہوگا۔

اسلام' انسان کو اس قدر احترام دیتا ہے کہ اگر انسان منعقد شدہ نطفے کی صورت میں بھی ہو' تو اسے ساقط کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

بچہ جس مرحلے میں بھی سقط کیا جائے' اسلام نے اسکی مناسبت سے دیت کا تعین کیا ہے۔

فقہائے عظام فرماتے ہیں کہ: اگر انسان کوئی ایسا عمل انجام دے' جس کی وجہ سے حاملہ عورت کا بچہ

ساقط (ضائع) ہو جائے' تو اگر سقط ہونے والا بچہ ابھی صرف نطفہ تھا' تو اس کی دیت بیس مثقال سکہ دار سونا ہے اور اگر علقہ (یعنی منجمد خون) ہو' تو اسکی دیت چالیس مثقال اور اگر مضغہ (یعنی گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں) ہو' تو اسکی دیت ساٹھ مثقال اور اگر وہ ہڈیاں بننے کے مرحلے تک پہنچ گیا ہو' تو اسکی دیت اسی مثقال اور اگر اس پر گوشت چڑھ گیا ہو' تو سو مثقال اور اگر اس میں روح آ چکی ہو' تو اگر وہ لڑکا ہو' تو اسکی دیت ہزار مثقال اور اگر لڑکی ہو' تو اسکی دیت پانچ سو مثقال ہوگی۔

فقہا یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کسی حاملہ عورت کو قتل کر دے' تو اسے عورت اور اس بچے کی دیت بھی دینا پڑے گی جو اس عورت کے شکم میں تھا۔ اگر اس عورت کے شکم میں دو یا دو سے زیادہ بچے ہوں' تو اسی مناسبت سے ساقط کرنے والے پر ان کی دیت واجب ہوگی۔ لیکن اگر حاملہ عورت خود ہی بچے کو سقط کرے' تو اسے بچے کے ورثاء کو اسکی دیت ادا کرنی چاہئے اور اس دیت میں خود اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

قتلِ عمد کی صورت میں قاتل پر دیت کے ساتھ ساتھ کفارۂ جمع بھی واجب ہے۔ یعنی اسے چاہئے کہ ایک غلام آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل دو ماہ روزے بھی رکھے اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا بھی کھلائے۔ اور اگر چند لوگوں نے مل کر کسی ایک شخص کو قتل کیا ہو' تو ان سب پر کفارہ واجب ہے۔ (تحریر الوسیلہ۔ ج ۲۔ ص ۵۹۷' ۵۹۸ اور ۶۰۶)

ان سخت احکام میں سے ہر حکم' انسانی قتل اور انسانی جان کو نقصان پہنچانے کے گناہ کی سنگینی کو واضح کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اس عمل سے شدت کے ساتھ پرہیز کریں۔ کیونکہ ان ظاہری سزاؤں کا مستوجب بننے اور دنیوی رسوائی کا مستحق قرار پانے کے علاوہ اس عمل کے نتیجے میں معنوی رسوائی بھی ان کا مقدر بنے گی۔ مکافاتِ عمل میں قتل کی مکافات بھی شامل ہے' جو بہت جلد قاتل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس حوالے سے موجود سیکڑوں مثالوں میں سے' یہاں صرف دو مثالیں قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائیں:

۱:۔ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ: اصفہان کے نواحی جنگل میں ایک شخص نے ایک مسلمان کو

قتل کر دیا۔ پھر اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کیلئے مقتول کی لاش ایک کنویں میں پھینک دی۔ مقتول کا کتا اس کنویں کے پاس آتا اور اس کے اطراف کی مٹی کنویں میں ڈالنے لگتا اور جوں ہی قاتل کو دیکھتا اس کی جانب لپکتا اور زور زور سے بھونکنے لگتا۔ کتے کے بار بار یہ عمل دُھرانے سے مقتول کے ورثاء کو تشویش ہوئی۔ ان لوگوں نے اس کنویں میں تلاش کیا' تو انہیں وہاں مقتول کی لاش مل گئی۔ اسکے بعد انہیں اس شخص کے بارے میں شک ہوا جس کی جانب کتا بار بار لپکتا تھا۔ اس شخص کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا اور بالآخر اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ (بحار الانوار۔ ج ۶۲۔ ص ۶۰) وہ شخص رسوا ہوا اور اسے اسکے جرم کی سزا دی گئی۔

۲: ایک ظالم اور بے رحم سردار' ایک دن ایک نیک دل شہزادے کے یہاں دعوت پر اس کے دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اتفاق سے اس دسترخوان پر دو بھنے ہوئے تیتر رکھے گئے۔ جوں ہی اس سردار کی نگاہ ان تیتروں پر پڑی' یہ انہیں دیکھ کر ہنسنے لگا۔ شہزادے نے جب اس سے اس بے موقع قہقہے کی وجہ پوچھی تو سردار نے جواب دیا کہ ایک روز جنگل میں مجھے ایک تاجر ملا' میں نے اسے پکڑا' اسکا مال و اسباب لوٹا اور اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ تاجر میرا ارادہ بھانپ گیا' اسی اثنا میں اس تاجر کی نگاہ ایک پہاڑی پتھر پر بیٹھے ہوئے دو تیتروں پر پڑی' تاجر نے ان تیتروں کو مخاطب کر کے کہا: اے تیترو! گواہ رہنا کہ یہ شخص میرا قاتل ہے۔

آج جب دسترخوان پر مجھے یہ دو تیتر بھنے ہوئے نظر آئے تو مجھے اس تاجر کی بے وقوفی یاد آ گئی کہ وہ جن تیتروں کو اپنے قتل کا گواہ بنا رہا تھا وہ خود ذبح ہو کر ہماری خوراک بن رہے ہیں اور اب گواہی دینے کیلئے زندہ نہیں رہے ہیں۔

نیک دل شہزادے نے اس ظالم سردار سے کہا: اتفاقاً تیتروں نے گواہی دے دی ہے۔ پھر اس نے اسی وقت حکم دیا کہ اس سردار کی گردن اڑا دی جائے۔ اور یوں آخر کار اس ظالم کو اپنے جرم کی سزا بھگتنی پڑی۔ (حیات الحیوان)

پیغمبر اسلام اور ائمہ کے اقوال میں انسانی قتل کا گناہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: جب کبھی مسلمانوں میں سے دو افراد

ناحق ایک دوسرے کے خلاف تلوار نکال لیں' اور اس مڈبھیڑ کے دوران ان میں سے کوئی ایک مارا جائے' تو یہ دونوں افراد جہنمی ہوں گے۔

اس موقع پر موجود افراد میں سے ایک نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! مقتول کیوں جہنمی ہوگا؟ آنحضرت نے جواب دیا: لانّہ اراد قتلاً (کیونکہ وہ بھی قتل کا ارادہ رکھتا تھا۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۱۔ ص ۱۱۳) لیکن اس کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اور وہ خود مارا گیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ارشاد ہے: مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَكْتُوبًا بَيْنَ عَيْنَيْهِ آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (جو شخص کسی مومن کو قتل کرنے میں کسی قاتل کی مدد کرے (چاہے یہ مدد ایک لفظ کہہ کر ہی کیوں نہ کی گئی ہو) تو ایسا شخص روزِ قیامت خدا سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اسکی پیشانی پر تحریر ہوگا کہ یہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔ کنز العمال۔ حدیث ۳۹۸۹۵)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے فرمایا ہے: قَتْلُ الْمُؤْمِنِ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ زَوَالِ الدُّنْيَا (خدا کے نزدیک مومن کا قتل دنیا کی بربادی سے زیادہ بڑی (بُری) بات ہے۔ کنز العمال۔ حدیث ۳۹۸۸۰)

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے: مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا اَثْبَتَ اللّٰهُ عَلٰی قَاتِلِهِ جَمِيعَ الذُّنُوبِ (جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرتا ہے' تو خداوند عالم مقتول کے تمام گناہ اس (قاتل) کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتا ہے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۹۔ ص ۷)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے: جس شخص نے کسی مومن کو قتل کیا ہو' جب اس شخص کی موت کا وقت آتا ہے' تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اسلام کے سوا جس دین پر چاہو مرو' چاہو تو یہودی' چاہو تو عیسائی اور چاہو تو مجوسی مرو۔ (ثواب الاعمال وعقاب الاعمال (مترجمہ فارسی) ص ۲۳۵)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: قیامت کے روز سب سے پہلے اس شخص کا محاکمہ ہوگا جس نے کسی انسان کا خون بہایا ہوگا۔ آدم کے بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کو لایا جائے

گا اور ان کے بارے میں فیصلہ ہوگا (اور ہابیل کو قتل کرنے کے جرم میں قابیل کے خلاف فیصلہ دیا جائے گا)۔ اسکے بعد زمانے کی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے افراد کو لایا جائے گا اور ان کا محاکمہ ہوگا' یہاں تک کہ کوئی ایک بھی باقی نہ رہے گا۔ ہر مقتول اپنے قاتل کو میدان میں لائے گا۔ اس موقع پر مقتول کا چہرہ اپنے خون سے رنگین ہوگا اور وہ لوگوں سے کہہ رہا ہوگا کہ: اس شخص نے مجھے قتل کیا ہے۔ اور خداوند عالم قاتل سے کہے گا کہ: کیا تو نے اس شخص کو قتل کیا ہے؟ اور (اس وقت) قاتل میں اتنی طاقت نہ ہوگی کہ وہ اپنا معاملہ خدا سے پوشیدہ رکھ سکے۔ (ثواب الاعمال وعقاب الاعمال (مترجمہ فارسی) ص ۲۳۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: وَادٍ فِي جَهَنَّمَ لَوْ قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا كَانَ فِيهِ وَلَوْ قَتَلَ نَفْسًا وَاحِدَةً كَانَ فِيهِ (دوزخ میں ایک وادی ہے' اگر کوئی شخص تمام انسانوں کو قتل کر دے تو یہ وادی اسکا ٹھکانہ ہوگی اور اگر کسی نے ایک انسان کو بھی قتل کیا ہوگا' تو اسے بھی اسی وادی میں ڈالا جائے گا۔ میزان الحکمۃ۔ ج ۸۔ ص ۳۹)

نیز آپ ہی کا ارشاد ہے: خداوند عالم نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کو وحی کی کہ بنی اسرائیل سے کہو کہ انسانوں کو قتل کرنے سے پرہیز کریں۔ کیونکہ جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے گا' تو خداوند عالم اسے آتشِ دوزخ میں سو مرتبہ اس طرح قتل کرے گا جس طرح اس نے (اس انسان کو) قتل کیا ہوگا۔ (اختصاص از شیخ مفید۔ ص ۲۳۵)

ابو سعید خدری نقل کرتے ہیں کہ: رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا ایک مسلمان کا قتل ہوا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اسکا قاتل کون ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیظ میں آگئے اور اسی وقت لوگوں کو مسجد میں طلب کیا' منبر پر تشریف لے گئے اور حمد وثنائے الٰہی کے بعد فرمایا: مسلمان کا قتل ہوتا ہے اور کسی کو اسکے قاتل کا پتا نہیں! اُس خدا کی قسم' جس کے اختیار میں میری جان ہے' جب بھی آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں نے کسی مومن کے قتل پر اتفاق کیا ہے' یا اس پر اظہارِ رضامندی کیا ہے' تو خداوند عالم نے ان سب کو آتشِ جہنم میں ڈالا ہے۔ خدا کی قسم' جو کوئی بھی ظلم کرتے ہوئے کسی شخص کو ایک تازیانہ مارے گا' تو روزِ قیامت آتشِ جہنم کے درمیان

ویسے ہی تازیانے سے اسے پیٹا جائے گا۔۔۔(بحارالانوار۔ج ۱۰۴۔ص ۳۸۴)

انسانی قتل کے گناہ کی سنگینی کو بیان کرنے والی سیکڑوں روایات میں سے منتخب کردہ مذکورہ روایات میں سے ہر روایت انسانی قتل کو سخت اور دردناک سزاؤں کی وجہ بننے والا گناہ قرار دیتی ہے اور مسلمانوں کو اس خطرناک عمل کے ارتکاب سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہے۔

انسانی قتل میں تعاون کا گناہ

جس طرح انسان کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے' اسی طرح کسی انسان کے قتل میں تعاون کرنا بھی سخت اور بڑے گناہوں میں سے ہے۔ چاہے یہ تعاون براہِ راست نہ بھی کیا گیا ہو' انتہائی معمولی اور خفی ہی کیوں نہ ہو' چاہے مدد کرنے والے نے صرف ایک لفظ کے ذریعے ہی مدد کی ہو' تب بھی ایسا شخص شریکِ جرم اور "اعوان الظلمة" سمجھا جائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی متعدد روایات اس مسئلے پر تاکید کرتی ہیں' آیاتِ قرآنی بھی اس نکتے پر گواہی دیتی ہیں۔ مثلاً ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَان (اور گناہ اور ظلم وستم میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرنا۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۲)

اس حوالے سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام کے چند اقوال قارئین کی خدمت میں پیش ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَوْاَنَّ رَجُلاً قُتِلَ بِالْمَشْرِقِ وَآخَرُ رَضِیَ بِهٖ بِالْمَغْرِبِ كَانَ كَمَنْ قَتَلَهٗ وَشَرَكَ فِی دَمِهٖ (اگر مشرق میں کسی شخص کا قتل ہو' اور مغرب میں رہنے والا کوئی شخص اس قتل پر راضی ہو' تو (یہ شخص بھی) قاتل کی مانند ہے اور مقتول کے خون میں شریک ہے۔ بحارالانوار۔ ج ۱۰۴۔ص ۳۸۴)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: قیامت کے دن ایک شخص کو ایک دوسرے شخص کے پاس لائیں گے۔ پہلا شخص دوسرے شخص کو خون سے رنگین کرے گا۔ جب دوسرا شخص اس سے خون آلود کرنے کی وجہ پوچھے گا' تو وہ جواب دے گا کہ: تم نے فلاں دن میرے بارے میں فلاں کلمہ کہا

تھا جس کی وجہ سے میرا خون بہایا گیا تھا' آج تم اس کا جواب دو۔ (ثواب الاعمال از شیخ صدوق (مترجمہ فارسی) ص ۲۳۴)

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا کہ مسجد "جھینہ" میں ایک مقتول کا جنازہ رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے اور پیدل اس مسجد کی جانب تشریف لے گئے۔ لوگوں کو پتا چلا تو سب اس مسجد میں جمع ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! ہمیں پتا نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا: کیا یہ مناسب بات ہے کہ کسی مسلمان مقتول کا جنازہ مسلمانوں کے درمیان موجود ہو اور وہ اس بات سے بے خبر ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ اس خدا کی قسم جس نے مجھے اپنی نبوت کیلئے برحق مبعوث کیا ہے' اگر آسمانوں اور زمین کے رہنے والے تمام لوگ کسی مسلمان کا خون بہانے میں شریک ہوں' یا اس عمل پر راضی ہوں' تو خداوندِ عالم ان سب کو منہ کے بل آتشِ جہنم میں پھینک دے گا۔ (ثواب الاعمال از شیخ صدوق (مترجمہ فارسی) ص ۲۳۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ارشاد ہے: قیامت کے دن ایک انسان کو لے کے آئیں گے جس نے دنیا میں کسی کا خون نہیں بہایا ہوگا۔ پھر اسے خون سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا برتن دیں گے اور اس سے کہیں گے کہ یہ فلاں مقتول کے خون میں تمہارا حصہ ہے۔ وہ عرض کرے گا: بارالٰہا! تو جانتا ہے کہ میں نے پوری زندگی کسی کا خون نہیں بہایا۔ خداوند عالم فرمائے گا: ہاں (درست ہے لیکن) تو نے فلاں شخص کی ایک بات سنی اور اسے دوسروں سے نقل کیا۔ یہ بات دوسروں تک پہنچی' یہاں تک کہ وہ بات اس زمانے کے ظالم حکمراں کو بتائی گئی اور اس ظالم حکمراں نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ لہٰذا تو نے اس مقتول کا خون بہانے میں اتنا حصہ لیا ہے۔ (محاسنِ برقی۔ ص ۱۰۴' بحارالانوار۔ ج ۱۰۴۔ص ۳۸۳)

ہم اس امید کے ساتھ اس موضوع پر اپنی گفتگو تمام کرتے ہیں کہ یہ آیات و روایات اور دل ہلا دینے والے کلمات ہم سب کیلئے باعثِ انتباہ ہوں گے اور ہم سختی کے ساتھ اس بات کا خیال

رکھیں گے کہ کبھی کہیں کسی بے گناہ کا خون بہانے میں شریک نہ ہوں جس کی سزا انتہائی شدید ہے اور خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہر قسم کی خونریزی سے شدت کے ساتھ پرہیز کرتے ہیں۔

اس گفتگو کو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ایک انتہائی حدیث پر ختم کرتے ہیں:

مولا کی خدمت میں تین افراد کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ ان میں سے ایک نے ایک شخص کو پکڑا اور اس کی نگرانی کرتا رہا' دوسرا آیا اور اس نے اسے قتل کر دیا اور تیسرا یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ حضرت علی نے فیصلہ سنایا کہ: جس شخص نے مقتول کی نگرانی کی اسے قید کر دیا جائے' یہاں تک کہ قید ہی میں اس کی موت واقع ہو۔ قتل کرنے والے شخص کو سولی پر چڑھا دیا جائے اور جس شخص نے اس پورے واقعے کو دیکھا' اس کا تماشائی رہا اور اس کا سدباب نہیں کیا' سلائی پھیر کر اسکی آنکھیں اندھی کر دی جائیں۔ (بحار الانوار۔ ج ۱۴۔ ص ۳۸۶)

ناجائز صنفی تعلقات سے سخت اجتناب

قرآنِ مجید سورۂ فرقان میں بیان ہونے والی خدا کے ممتاز اور خاص بندوں کی بارہ خصوصیات میں سے آٹھویں خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے کہ: وَلَا يَزْنُوْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا (اور (وہ) زنا بھی نہیں کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا عمل انجام دے گا وہ اسکی بہت سخت سزا پائے گا۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۸)

اس آیت میں خدا کے صالح اور نیکوکار بندوں کی ایک انتہائی اہم فضیلت بیان کی گئی ہے۔ یہ اہم فضیلت عفت و پاکدامنی کی حفاظت' اور ہر قسم کے ناجائز صنفی تعلقات سے شدت کے ساتھ اجتناب ہے۔ کیونکہ عفت کے منافی عمل ''زنا'' بے عفتی کی ایک انتہائی گھناؤنی صورت ہے۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ صحت مند اور سالم معاشرے کا ایک عامل عفت و پاکدامنی اور عزت و ناموس کے بارے میں ''غیرت'' کا اصول ہے' جس کی غیر معمولی اہمیت کے تمام انبیاء' ائمہ اور صاحبانِ عقل و دانش قائل ہیں' یہ اصول انسانی برادری اور مردوں اور عورتوں کے درمیان جائز اور معقول تعلقات کو تقویت پہنچاتا ہے اور بہت سی معاشرتی اور گھریلو خرابیوں' گمراہیوں اور بدبختیوں سے تحفظ کیلئے ایک مضبوط ڈھال ہے۔

زنا جو گھناؤنا ترین جنسی گناہ ہے اسکے بہت سے شرمناک اور تباہ کن اثرات ہیں اور جو خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ' فتنہ و فساد' خودکشی' منشیات کا عادی ہو جانا' قساوتِ قلبی اور بہت سے

بڑے بڑے جرائم کی بنیاد بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس برے عمل کے قریب جانے تک سے منع کیا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا (اور دیکھو زنا کے قریب بھی نہ جانا کہ یہ بدکاری اور بہت برا راستہ ہے۔ سورۂ بنی سرائیل ۱۷۔ آیت ۳۲)

اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زنا نہ کرنا' بلکہ کہتی ہے کہ اس شرمناک اور قبیح عمل کے قریب بھی نہ جانا۔ اس تعبیر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر اوقات انسان ایسے مقدمات کے نتیجے میں زنا میں مبتلا ہوتا ہے جو اسے تدریجاً اس عمل کے قریب لیجاتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ ان مقدمات سے بھی سختی کے ساتھ پرہیز کرے۔ نظر بازی' عریانی' پردے کی طرف سے بے توجہی' ہیجان انگیز فلمیں دیکھنا' گمراہ کن لٹریچر کا مطالعہ اور بے راہ روی کا باعث بننے والی موسیقی اور گانوں کا سننا وہ باتیں ہیں جن میں سے ہر ایک جنسی گمراہی اور زنا کے ارتکاب کی وجہ بن سکتی ہے اور انسان کو بے راہ روی کی جانب لے جاسکتی ہے۔

زنا' اسلام کی نظر میں بہت بڑا گناہ ہے لہٰذا اُس میں اسے انجام دینے والے کیلئے سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ اگر محرم عورتوں کے ساتھ زنا کیا جائے۔ یا زنائے محصنہ ہو (یعنی شادی شدہ مرد یا شادی شدہ عورت زنا کا ارتکاب کرے) تو اسے سنگسار کرنے یا سزائے موت دینے کا حکم ہے۔ اور اگر زنائے غیر محصنہ ہو۔ تو پہلی مرتبہ ارتکاب کی صورت میں قاضی کے حکم سے زنا کرنے والے کو سو کوڑے مارے جائیں گے۔ دوسری مرتبہ ارتکاب پر بھی اس پر یہی حد جاری کی جائے گی۔ لیکن تیسری یا چوتھی مرتبہ اس جرم کے ارتکاب پر اس کیلئے سزائے موت کا حکم جاری کیا جائے گا۔ بعض مواقع پر زنا کرنے والے کو تازیانے بھی مارے جائیں گے اور سنگسار بھی کیا جائے گا۔ جیسے زنائے محصنہ کرنے والے بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت کو۔ (تحریر الوسیلہ۔ ج ۲۔ ص ۴۶۳)

ارتکاب زنا پر یہ سخت دنیوی سزائیں' اس گناہ کی شدت اور اسکے انتہائی برے اور تباہ کن اثرات کی جانب اشارہ ہیں۔ اسلام جو ایک مقدس آئین ہے' اور سالم و صحت مند معاشرے اور ایک پرسکون گھریلو زندگی کا خواہشمند ہے' وہ ان سخت سزاؤں کے ذریعے ہر قسم کی جنسی گمراہی

اور گناہ کی روک تھام چاہتا ہے' نیز یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرے کی عفت و پاکدامنی کو اس پر نقب لگانے والوں سے محفوظ رکھا جائے۔

قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں' زنا کے مرتکب افراد کیلئے شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ اور خبردار خدا کے دین کے معاملے میں کسی مروت کا شکار نہ ہو جانا' اگر تمہارا ایمان اللہ اور روزِ آخرت پر ہے۔ اور اس سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو اسکا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۲)

اس آیت میں تین ایسے نکات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے' جن میں سے ہر ایک زنا کے اس سخت گناہ کے خلاف اسلام کے شدید موقف کی نشاندہی کرتا ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ: زنا کے مرتکب مرد اور عورت کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ: اس حکم پر عمل درآمد کے موقع پر ان سے کسی قسم کی نرمی اور ہمدردی نہ کی جائے اور ان کے بارے میں قانونِ الٰہی کو دوٹوک انداز میں جاری کیا جائے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ: یہ حکمِ الٰہی برسرِ عام جاری کیا جائے' اور اس موقع پر کچھ لوگ موجود ہوں جو مجرموں کو کوڑے کھاتے دیکھیں۔ تاکہ ایک طرف تو زنا کار اچھی طرح اس سزا کا مزہ چکھے اور دوسری طرف تماشائیوں کو بھی عبرت ہو اور وہ اس گناہ کے ارتکاب سے باز رہیں۔

جنسی آلودگی سے پرہیز اور محفوظ رہنے کے راستے

یہاں سورۂ فرقان کی جس آیت پر گفتگو ہو رہی ہے اُس میں عفت و پاکدامنی کی حفاظت اور جنسی گمراہی اور آلودگی (بالخصوص زنا) سے پرہیز کو خدا کے خاص اور ممتاز بندوں کی ایک صفت بتایا گیا ہے' نیز دوسری متعدد آیات میں بھی (جن میں سے ہم نے یہاں صرف دو کے بیان پر اکتفا کیا ہے) اس بڑے گناہ کے ارتکاب کی ممانعت کی گئی ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اب ہم کونسے طریقے اختیار کریں جس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ اس قبیح عمل کا مرتکب نہ ہو اور اس سے محفوظ

رہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس گناہ سے اجتناب اور اسکی روک تھام کے مجموعی طور پر دو راستے ہیں۔ ایک' نظری راستہ اور دوسرا' عملی راستہ۔

پہلا راستہ جسے ہم نے نظری راستے کا نام دیا ہے' اسکے بارے میں عرض ہے کہ اس گناہ کی شدت اور سنگینی کی طرف متوجہ رہا جائے اور جنسی گمراہی کی قباحت اور اسکے شرمناک آثار کے بارے میں ذہن کو حاضر رکھا جائے۔

اس طرح عقل' تجربے کی مدد کے ہمراہ ہم سے کہے گی کہ اگر جنسی گمراہی' بالخصوص زنا ہمارے معاشرے میں رائج ہو جائے (جیسا کہ پست مغربی تمدن میں دیکھا جا رہا ہے اور لرزہ طاری کر دینے والے اعداد و شمار اسکے گواہ ہیں) تو یہ بہت سی برائیوں اور تباہیوں کا موجب ہو جائے گا۔ کیونکہ عفت و پاکدامنی کے منافی یہ عمل ایک طرف تو طرح طرح کے امراض مثلاً "ایڈز" کی لاعلاج مہلک بیماری کا باعث ہوا ہے' اور دوسری طرف اس نے وہاں کی نئی نسل کو گھر بسانے اور عائلی زندگی اپنانے سے دور رکھا ہے اور اسمیں بے نظمی اور عزم و ہمت میں کمی کا باعث بنا ہے۔

عائلی زندگی گزارنے والوں اور رشتۂ ازدواج کی بنیاد رکھنے والوں کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ گھر سے باہر جنسی تعلق کا قیام محبت بھری عائلی زندگی میں بحران اور بداعتمادی کی وجہ بنتا ہے اور اسکا آخری نتیجہ میاں بیوی کے درمیان طلاق اور خاندان کی تقسیم کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ زنا' ناجائز بچوں کی ولادت کا باعث ہے' جس کی وجہ سے وہ تعلق جو بچوں اور والدین کے درمیان قائم ہونا چاہئے وہ قائم نہیں ہو پاتا اور نتیجے کے طور پر افراد معاشرہ کا باہمی تعلق جس کی بنیاد اہلِ خانہ کے باہمی تعلقات پر استوار ہوتی ہے متزلزل ہو جاتا ہے اور معاشرہ زوال و انحطاط کی طرف چل پڑتا ہے۔

زنا کے عام ہو جانے کا ایک اور برا اثر یہ ہے کہ یہ عمل لوگوں کے ازدواجی زندگی سے دور ہونے کا باعث بن جاتا ہے اور اسکے نتیجے میں شادی کے نیک اور مثبت اثرات' جیسے روحانی سکون'

صحیح اور فطری راستے سے جنسی خواہش کی تسکین' روحانی انس' زندگی کے کاموں میں باہمی تعاون' اچھے بچوں کی تربیت اور دوسرے اچھے معاشرتی اثرات مرتب ہونے کی بجائے گمراہی اور اسکے تباہ کن اثرات سامنے آتے ہیں۔

اس مسئلے پر غور و فکر' انسان کو اس برے عمل سے دور رکھے گا اور بڑی حد تک اسے جنسی گمراہی میں مبتلا ہونے بالخصوص پاکدامنی کے منافی عمل "زنا" کے ارتکاب سے باز رکھے گا۔ کیونکہ کوئی بھی عقل مند آدمی ایسے عمل کا مرتکب نہیں ہوگا جو ایسے تباہ کن جسمانی اور روحانی اثرات کا باعث ہو' اور جس کے ایسے بھیانک نتائج برآمد ہوں۔

دوسرا راستہ جو عملی راستہ ہے' اسکے بارے میں عرض ہے کہ یہ راستہ ہم سے کہتا ہے کہ ہمیں بے عفتی اور جنسی گمراہی کے عوامل و اسباب سے آگاہ ہونا چاہئے اور اس سے چھٹکارے کے راستے جاننا چاہئیں اور منصوبہ بندی کے ذریعے اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

اس حوالے سے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اپنی نیت کو سالم اور پاک رکھیں' تاکہ ہمارا فیصلہ بھی پاک اور سالم ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ گفتگو کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا: موسیٰ اپنے اصحاب سے کہتے تھے کہ زنا نہ کرنا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ زنا کا خیال بھی دل میں نہ لانا (اسکے بعد انہوں نے یہ مثال پیش کی) اگر کوئی شخص ایک خوبصورت نقاشی سے مزین کمرے میں آگ جلائے' تو اس آگ کا دھواں اس کمرے کو دھواں آلود اور سیاہ کر دے گا' اگرچہ آگ نے اس کمرے کو جلا کر راکھ نہیں کیا ہوگا۔ زنا کا خیال اسی دھوئیں کی مانند ہے جو انسان کے معنوی چہرے کو بدنما کر دیتا ہے اگرچہ یہ چہرہ ختم نہیں ہوا ہوتا۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۵۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی عفت' غیرت اور پاکیزگی کا عالم یہ تھا کہ جب ان کے فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو ایک طرف تو آپ انتہائی خوش تھیں' اور دوسری طرف یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں نادان لوگ ان کی پاکدامنی پر انگلیاں نہ

اٹھائیں' مضطرب اور سخت پریشان بھی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ: یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل فراموش کردی گئی ہوتی۔ سورۂ مریم ۱۹۔ آیت ۲۳)

مغربی دنیا' جس کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی پیروی کا دعویٰ کرتی ہے اور جس میں دن بدن بے راہ روی اور آوارگی بڑھ رہی ہے' درحقیقت حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم کے دین و آئین سے دور ترین لوگ ہیں۔ ان کی گستاخی اس حد تک جا پہنچی ہے کہ وہ حضرت مریم کی تصویر کے طور پر ایک بدحجاب اور نیم عریاں عورت کی تصویر شائع کرتے ہیں۔ یہ ایسی گستاخی اور شرمناک اہانت ہے جو یقیناً حضرت مریم کی پاک روح کو آزردہ کرتی ہوگی۔ وہ آج اس صورتحال کو دیکھ کر فرماتی ہوں گی کہ: کاش! میں دنیا میں نہ آئی ہوتی اور بالکل بھلا دی گئی ہوتی اور مجھے اس قسم کی تصاویر اور مجسموں کی صورت میں پیش نہ کیا گیا ہوتا اور ایسی بے ہودہ تصویر کے ذریعے' جس کا مجھ سے دور کا بھی واسطہ نہیں' میری عفت کا مذاق نہ اڑایا گیا ہوتا۔

بہر حال' فکر کی پاکیزگی کے مرحلے کے بعد ان عوامل و اسباب کو پہچاننا اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے جو انسان کو جنسی گمراہی کے ہولناک گڑھے کے کنارے لے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند عوامل درج ذیل ہیں:

۱۔ لوگوں کے سامنے بے حجابی یا حجاب سے بے پروائی کے ساتھ آنا۔ کیونکہ یہ چیز جنسی شہوت کی آگ کو بھڑکاتی اور جنسی آلودگیوں کا موجب ہوتی ہے۔

۲۔ نگاہوں کو کنٹرول نہ کرنا اور وسوسہ پیدا کرنے والی نگاہوں سے اجتناب نہ کرنا۔

۳۔ گمراہ کن فلموں اور شہوت انگیز مناظر دیکھنا اور مردوں اور عورتوں کا باہم مخلوط ہونا۔

۴۔ بری باتیں سکھانے والی مطبوعات کا مطالعہ کرنا۔

۵۔ ہیجان انگیز تصاویر دیکھنا۔

۶۔ حرام غذاؤں کا استعمال اور پرخوری۔

۷۔ برے دوستوں کی صحبت۔

۸۔ شادی جو جنسی خواہش کی تسکین اور جنسی گمراہی سے نجات میں موثر کردار کی حامل ہے' اس میں بلاوجہ تاخیر کرنا۔

ایک موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: یَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ اِنْ اِسْتَطَاعَ مِنْکُم الْبَاءَۃَ فَلْیَتَزَوَّجْ فَاِنَّہُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَعَلَیْہِ بِالصَّوْمِ (اے جوانوں کے گروہ! تم میں سے جو کوئی شادی کر سکتا ہے' اسے چاہئے کہ شادی کرے' کیونکہ شادی کی وجہ سے انسان (دوسروں کی ناموس کی طرف سے) نگاہیں نیچی کر لیتا ہے اور اپنے دامن کو بے عفتی کی آلودگی سے بچا لیتا ہے۔ اور جو کوئی شادی نہیں کر سکتا' اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۷۹)

اپنے اندر حیا' عفت' حمیت اور اپنے ناموس کے بارے میں غیرت جیسی صفات پیدا کرنا بھی انسان کو جنسی گمراہیوں اور زنا سے باز رکھنے والے طاقتور عوامل میں سے ہے۔ اس بارے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: مَازَنٰی غَیُوْرٌ قَطُّ (غیرت مند انسان کسی صورت زنا نہیں کرتا۔ نہج البلاغہ۔ کلماتِ قصار ۳۰۵)

نیز آپ ہی نے فرمایا ہے: عِفَّۃُ الرَّجُلِ عَلٰی قَدْرِ غَیْرَتِہٖ (انسان اتنا ہی پاکدامن ہوتا ہے جتنی اس میں غیرت ہوتی ہے۔ غرر الحکم)

بے عفتی کے خلاف پیغمبر اسلام کا شدید موقف

پیغمبر اسلام معاشرے کی عفت و ناموس کی حفاظت کے سلسلے میں انتہائی حساس تھے۔ آپ نے بارہا فرمایا کہ: کَانَ اِبْرَاھِیْمُ اَبِیْ غَیُوْرًا وَ اَنَا اَغْیَرُ مِنْہُ وَ اَرْغَمَ اللّٰہُ اَنْفَ مَنْ لَا یُغَارُ (میرے باپ ابراہیم بہت غیرت مند تھے اور میں ان سے زیادہ غیرت مند ہوں۔ خداوند عالم بے غیرت انسان کی ناک خاک پر رگڑ دیتا ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۱۰۳۔ ص ۲۹۳)

اس حوالے سے درج ذیل دو قصے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مروان بن حکم کا باپ اور حضرت عثمان کا چچا حکم بن ابی العاص مہاجر مسلمان ہونے کے باوجود دوسروں کی عزت و ناموس پر بری نظر رکھتا تھا۔ ایک روز اس نے مدینہ میں پیغمبر اکرم کے گھر

کے دروازے سے آنحضرت کے گھر میں جھانکا۔ آنحضرت کو اس کے اس گھناؤنے عمل کی خبر ہوگئی اور آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ آپ نے ایک کمان اٹھالی تا کہ اس کے ذریعے اسے تیر کا نشانہ قرار دیں۔ لیکن وہ بھاگ کھڑا ہوا اور چھپ گیا۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۲۹۳)

ایک دوسری روایت کے مطابق آنحضرت نے خمیدہ سر کی ایک لاٹھی، جس کی نوک تیز تھی اٹھائی اور اسکے پیچھے دوڑے، وہ سرپٹ دوڑا اور آنحضرت کی پہنچ سے نکل گیا۔ آنحضور نے فرمایا: اگر وہ میرے ہاتھ آجاتا تو اسکی آنکھیں نکال لیتا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ حکم اور اسکے بیٹے مروان کو جلاوطن کر کے طائف بھیج دیا جائے۔

یہ دونوں پیغمبر اسلام کے زمانے میں اور پھر اسکے بعد حضرت عمر اور حضرت ابوبکر کے ادوارِ خلافت میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں حضرت عثمان کی وساطت سے مدینہ لوٹ آئے۔ حضرت عثمان پر مسلمانوں نے جو اعتراضات کئے ان میں سے ایک شدید اعتراض یہ تھا کہ آپ نے ان لوگوں کو واپس کیوں بلایا جنہیں پیغمبر اسلام نے جلاوطن کیا تھا۔ (الغدیر۔ ج ۸۔ ص ۲۴۳، اسد الغابہ۔ ج ۲۔ ص ۳۳)

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ "ہیت" اور "ماتع" نامی دو افراد مدینہ میں فضول اور بیہودہ باتیں کرتے پھرتے ہیں اور عورتوں کی خوبصورتی کے تذکرے کر کے اور لوگوں کو بیہودہ لطیفے سنا کر معاشرے میں عفت و پاکدامنی کے ماحول کو نقصان پہنچانے کی وجہ بن رہے ہیں۔ آنحضرت نے انہیں بلایا اور انہیں سرزنش کرنے کے بعد مدینہ سے (چند فرسخ کے فاصلے پر) "العرایا" نامی مقام پر جلاوطن کر دیا۔ انہیں کھانے پینے کی اشیا اور ضروریاتِ زندگی کی خریداری کیلئے صرف جمعے کے دن مدینہ آنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد وہ پھر "العرایا" واپس چلے جاتے تھے۔ (بحار الانوار۔ ج ۲۲۔ ص ۸۸ سے اختصار کے ساتھ)

اس طرح آنحضرت نے انہیں تنبیہ کی اور آپ کے اس سخت موقف سے دوسروں کو یہ سبق ملا کہ وہ عفت و پاکدامنی کی حفاظت کر کے افرادِ معاشرہ کو جنسی گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

گناہ کی محفلوں میں شرکت سے پرہیز

قرآنِ کریم، سورۂ فرقان میں بیان کی گئی، خدا کے خاص بندوں کی بارہ صفات میں سے نویں صفت کے بارے میں فرماتا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (یہ لوگ جھوٹی گواہی (اور گناہ کی محفلوں میں شرکت) سے پرہیز کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۷۲)

یہ خدا کے خاص بندوں کی ایک ممتاز صفت ہے، جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے اور ہر قسم کے فضول، بیہودہ اور باطل امور کی آلودگی سے بچنے کا باعث ہوتی ہے، نیز اپنی اصلاح کیلئے وقت سے مفید استفادے کے سلسلے میں بہترین کردار ادا کرتی ہے۔

"زُوْر" کے معنی ہیں حق سے انحراف۔ یہ معنی متعدد امور مثلاً باطل، دروغ، حرام موسیقی اور ظلم و ستم پر صادق آتے ہیں، لیکن روایات کی بنیاد پر یہ لفظ اکثر جھوٹ، تہمت، بیہودہ موسیقی کی محفلوں اور باطل محافل کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

"شہادتِ زُور" جس کی مذکورہ بالا آیت میں ممانعت کی گئی ہے اور جسے ترک کرنا خدا کے ممتاز بندوں کی امتیازی خصوصیت قرار دیا گیا ہے، مفسرین نے اسکے دو معانی بیان کئے ہیں۔ ممکن ہے مذکورہ آیت میں یہ دونوں ہی معنی مراد ہوں۔

۱۔ یہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جس چیز کو حق نہیں سمجھتے اسکی تصدیق نہیں کرتے۔ باطل امور کی

تائید نہیں کرتے۔

۲۔ یہ لوگ عیاشی اور باطل ساز و آواز کی محفلوں میں شرکت نہیں کرتے۔ اور اپنی شرکت کے ذریعے ان فضول اور بیہودہ محفلوں اور ان کا انعقاد کرنے والوں کی تائید نہیں کرتے۔

ان معنی کو پیشِ نظر رکھیں تو اس آیت میں دو بڑی تباہ کن اور ناپسندیدہ دینی اور سماجی آفات سے پرہیز کی تلقین کی گئی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ ان آفات میں مبتلا ہو جائے' تو یہ اس معاشرے کی سلامتی' اسکے اچھے روابط و تعلقات اور اس میں عدل و انصاف کے لئے سنگین نقصان کا باعث ہوں گی اور اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کو گمراہی کی خطرناک راہوں پر لے جائیں گی۔

لہٰذا ان دونوں معانی کی تشریح ضروری ہے' تاکہ ان دونوں گناہوں اور بڑی آفات کی خرابی ہمارے سامنے واضح ہو جائے۔

ا۔ جھوٹی گواہی سے پرہیز

جھوٹی گواہی یا کسی ناحق بات کی تائید تہمت کہلاتی ہے' جو ایک گناہِ کبیرہ اور حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے اور جسے آیات و روایات کی زبان میں بہتان کہا گیا ہے' جو گناہ پر گناہ کا اضافہ ہے۔ کیونکہ یہ جھوٹ بھی ہے اور اسکی گواہی دینا حق کو باطل اور باطل کو حق ظاہر کرنا ہے۔ اس طرح یہ عمل دوسروں کے حقوق کی پامالی کا باعث بنتا ہے۔

جھوٹی گواہی اِس قدر ناپسندیدہ اور فتنہ و فساد انگیز عمل ہے کہ قرآنِ کریم نے اسکا ذکر بت پرستی کے ساتھ کیا ہے اور شدت کے ساتھ اِسکی ممانعت کی ہے' فرمانِ الٰہی ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (لہٰذا تم ناپاک بتوں سے پرہیز کرتے رہو اور جھوٹی گواہی سے اجتناب کرتے رہو۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۰)

تہمت اور بہتان جو جھوٹی گواہی بھی ہے' ایمان پر اِس قدر تباہ کن اثرات مرتب کرتی ہے کہ بقول امام جعفر صادق علیہ السلام: اذا اتّھَمَ المؤمِنُ اَخَاہُ' انماث الایمانُ فی قلبِہ' کما ینماثُ الملحُ فی الماء (اپنے برادرِ ایمانی پر تہمت لگانے والے شخص کے دل سے ایمان اس طرح گم ہو جاتا ہے جیسے پانی میں نمک غائب ہو جاتا ہے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۸۔ ص ۶۱۳)

یہی وجہ ہے کہ کسی کے لئے نقصاندہ ثابت ہونے والی تہمت پر خدا کی طرف سے انتہائی سخت سزا اور شدید عذابِ آخرت ہے۔ ابن یعفور نقل کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایسا شخص جو کسی مومن مرد یا عورت پر تہمت لگائے اور اُسکی طرف کوئی ایسی صفت منسوب کرے جو اُس میں نہ پائی جاتی ہو' تو خداوند عالم اُسے روزِ قیامت بدبودار پانی سے نکالے گا۔ (وسائل الشیعہ۔ ج ۸۔ ص ۶۰۳)

ظاہر ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن انتہائی کریہہ چہرے اور غلیظ و نفرت انگیز بدبو کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا جائے گا۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: مَنْ شَہِدَ شَہَادَۃَ زورٍ علی رجُلٍ مسلمٍ اوذِمّیٍ اوْمَن کانَ مِن النّاس عُلّقَ بلسانِہٖ یوْمَ القیامۃِ وھُوَ مع المُنافقین فی الدّرکِ الاسْفَلِ مِنَ النّارِ (ایسا شخص جو کسی مسلمان یا ذمی کا فریا کسی بھی انسان کے بارے میں جھوٹی گواہی دے گا روزِ قیامت اُسکی زبان باندھ دی جائے گی اور وہ منافقین کے ساتھ دوزخ کے نچلے ترین طبقے میں ہوگا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۶۔ ص ۳۶۴)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسولِ اکرم نے فرمایا ہے: مَنْ بَھَتَ مؤمِناً اَوْمؤمِنۃً اوقالَ فیہِ ما لَیْسَ فیہِ' اقامَہُ اللہُ یومَ القیامَۃِ علی تلٍّ مِنْ نارٍ حتیّٰ یخْرُجَ مِمّا قالَ فیہ (ایسا شخص جو کسی مومن مرد یا مومنہ عورت پر تہمت لگائے' یا اُن سے کوئی ایسی چیز منسوب کرے جو اُن میں نہ پائی جاتی ہو تو خداوند عالم ایسے شخص کو روزِ قیامت اُس وقت تک آگ کے ایک ڈھیر پر ٹھہرائے رکھے گا جب تک وہ اِس تہمت سے (جس پر تہمت لگائی ہے اسکے راضی ہونے کی وجہ سے) بری نہ ہو جائے۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۸۔ ص ۶۰۳' ۶۰۴)

ایک روز رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے سامنے کفار کی جانکنی کی سخت کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا: عزرائیل' کافر کے سامنے آگ کی ایک سیخ لائیں گے اور اُس کے ذریعے اسکے جسم سے اسکی روح نکالیں گے اور اس موقع پر جہنم ایک چیخ بلند کرے گا۔ حضرت علی نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کی امت میں کوئی ایسا شخص ہے جسکی

روح اس قدر اذیت ناک طریقے سے قبض کی جائے گی؟ آنحضرت نے جواب دیا: نَعَمْ' حاکِمُ جائر' و آکِلُ مالِ الیَتیمِ ظُلماً' وَشاھِدُزُورٍ (ہاں' (میری امت کے تین قسم کے لوگوں کی روح اس طرح قبض کی جائے گی) ظالم حکمراں کی' یتیم کا مال ناحق کھانے والے کی اور جھوٹی گواہی دینے والے کی۔ تحف العقول۔ ج ا۔ ص ۷۰)

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جھوٹی گواہی کئی قسم کی ہوتی ہے' مثلاً سیاسی الزام تراشی' عزت و ناموس پر بہتان باندھنا' مالی اور اقتصادی معاملات میں بدعنوانی کی تہمت لگانا وغیرہ وغیرہ۔ ان تہمتوں اور جھوٹی گواہیوں میں سیاسی تہمت اور کسی کی عزت پامال کرنا ناقابلِ معافی اور انتہائی بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ یہ عمل انتہائی برے اور تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے' اور محترم و معزز افراد کی عزت و وقار کو نقصان پہنچانے کا موجب ہو کر افراد اور معاشرے کیلئے انتہائی ناپسندیدہ نتائج کا باعث بنتا ہے۔

بعض خاص مواقع' مثلاً انتخابات کے موقع پر اس قسم کی الزام تراشیوں کا رواج عام ہے۔ اس عمل کا کم از کم ازالہ یہ ہے کہ تہمت لگانے والا انسان ان تمام لوگوں کے اذہان صاف کرے جنہوں نے اُسکی لگائی ہوئی تہمت سنی ہے اور کھلم کھلا اپنے جھوٹ کا اعتراف کرے اور اس بات کا اعلان کرے کہ جس پر اُس نے یہ الزام لگایا تھا وہ اس سے بری اور منزہ ہے۔

قارون نے ایک عورت کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگانا چاہی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اس تہمت سے محفوظ رکھا اور قارون پر اس قدر غضبناک ہوا کہ زمین کو حکم دیا کہ وہ قارون اور اسکے مال و دولت کو نگل جائے اور زمین نے خدا کے اس حکم کی تعمیل کی۔ (ان نکات کا مطالعہ سورۂ قصص کی آیت نمبر ا کیساتھ میں کیا جاسکتا ہے)

اسی طرح کسی کی عزت و ناموس پر الزام لگانا بھی ایک بڑا گناہ اور سنگین عقاب کا باعث ہے۔ یہاں تک کہ یہ عمل آخرت کے شدید عذاب کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی سخت سزا کا موجب ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الْفٰسِقُوْنَ (اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور چار گواہ فراہم نہیں کرتے' اُنہیں اَسّی کوڑے لگاؤ اور پھر کبھی اُن کی گواہی قبول نہ کرنا اور یہ لوگ سراسر فاسق ہیں۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۴)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی انسان کسی پاکدامن عورت کی عزت و ناموس کے بارے میں کوئی ناروا بات کہے' چاہے اُس نے سچ ہی کہا ہو' اُسے چاہئے کہ اسکے لئے چار گواہ بھی لائے' وگرنہ مجرم کے طور پر اَسّی کوڑے کھانے کو تیار رہے۔ یہ وہی "حد" ہے جو اسلامی فقہ میں "حدِ قذف" کے نام سے معروف ہے اور جو زنا یا لواط کا الزام لگانے والے پر جاری کی جاتی ہے۔ اگر یہ الزام چار مرتبہ لگایا جائے اور ہر مرتبہ کے بعد اس کے لگانے والے پر حد جاری ہو' تو چار مرتبہ کے بعد ایسے شخص کو موت کی سزا دینے کا حکم ہے۔ (تحریر الوسیلہ۔ ج ۲۔ ص ۴۷۶' ۴۷۹)

جھوٹی گواہی کی کچھ اور صورتیں بھی ہیں۔ مثلاً بعض فحش کلامی' گالم گلوچ' جیسے ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ تو زنا زادہ یا حرام زادہ یا ایامِ حیض کی پیدائش ہے۔ یہ تہمتیں گناہانِ کبیرہ میں سے ہیں اور اگر قاضی کے سامنے ثابت ہو جائیں تو ایسی تہمت لگانے والے شخص کو قاضی کے حکم سے سزا دی جائے گی۔

اس گفتگو کو مکمل کرنے کی غرض سے ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ نذرِ قارئین ہے:

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک دوست تھا' جو ہمیشہ آپ کے ہمراہ ہوا کرتا تھا۔ ایک روز اُس دوست نے ہندوستان سے تعلق رکھنے والے امام جعفر صادق کے ایک غلام سے کہا: اے زنا زادے! تو کہاں تھا؟ امام جعفر صادق اپنے دوست کی اس بدزبانی پر اس قدر ناراض ہوئے کہ اُسکی پشت پر ایک زوردار ہاتھ مارا اور فرمایا: سبحان اللہ! کیا تم اسکی ماں کو زانیہ قرار دے رہے ہو؟ میں تو سمجھتا تھا کہ تم متقی اور پرہیزگار شخص ہو۔ آج مجھے پتا چلا کہ تم بے تقویٰ ہو۔ اُس نے عرض کیا: میں آپ پر قربان جاؤں! اس غلام کی ماں کا تعلق سندھ سے ہے۔ وہ مشرک تھی اور اسی مشرکانہ زندگی میں اُس کے بطن سے اس غلام نے جنم لیا ہے' لہٰذا یہ غلام زنا زادہ ہے۔ امام نے فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہر قوم میں شادی بیاہ کا ایک قانون ہوتا ہے؟ تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ'

اب مجھے کبھی نظر نہ آنا۔

وہ بدزبان شخص امام کے پاس سے چلا گیا اور پھر آپ عمر بھر اس سے نہ ملے۔ (اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۳۲۴)

۲۔ بیہودہ محفلوں میں شرکت سے پرہیز

جن چیزوں پر جھوٹی گواہی کا عنوان صادق آتا ہے' اُن میں سے ایک ناشائستہ اور بیہودہ محفلوں میں شرکت اور ان میں حاضری ہے۔ زیرِ بحث آیت میں اس عمل کا ترک کرنا خدا کے ممتاز اور خاص بندوں کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسی محفلوں میں شرکت اور موجودگی ایک طرح سے باطل کی تائید اور لہو ولعب کی ان محافل کو رونق بخشنا ہے۔

اسی طرح' عام طور پر گناہ کے کاموں میں مشغول رہنے والے غیر صالح افراد کی ہم نشینی بھی جھوٹی گواہی کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنا اُن کے عمل کی تائید اور گناہ کے کاموں میں اُن کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے' ماسوا اسکے کہ جب نہی عن المنکر کا فریضہ اس بات کا تقاضا کرے کہ انسان ان مجالس میں شرکت کرے اور ان محفلوں کا ماحول بدل دینے کا ذریعہ بنے۔

قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر لہو ولعب کی محافل میں شرکت سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً اس آیت میں ہے کہ: **وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ** (اور اس نے کتاب میں یہ بات نازل کردی ہے کہ جب کچھ لوگوں کے بارے میں یہ سنو کہ وہ آیاتِ الٰہی کا انکار کر رہے ہیں اور اُن کا مذاق اڑا رہے ہیں' تو خبردار اُن کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا' جب تک وہ دوسری باتوں میں مصروف نہ ہو جائیں' ورنہ تم اُنہی کی مانند ہو جاؤ گے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۴۰)

اسی طرح کی گفتگو سورۂ انعام کی آیت نمبر ۶۸ میں بھی کی گئی ہے۔

ایک روز امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا: **مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَجْلِسُ فِيْ مَجْلِسٍ يُسَبُّ فِيْهِ اِمَامٌ اَوْ يُغْتَابُ فِيْهِ مُسْلِمٌ** (جو شخص خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے' وہ ایسی مجلس میں نہیں بیٹھتا جس میں امامِ حق کو برا بھلا کہا جاتا ہے' یا وہاں کسی

مسلمان کی غیبت کی جاتی ہے۔ اسکے بعد امام نے اس آیت (سورۂ انعام ۶۔ آیت ۶۸) کی تلاوت فرمائی کہ: **وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ** (اور جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری نشانیوں کے بارے میں بے ربط بحث کر رہے ہیں' تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ' یہاں تک کہ وہ دوسری بات میں مصروف ہو جائیں' اور اگر شیطان غافل کر دے تو یاد آنے کے بعد پھر ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھنا)۔ (بحار الانوار۔ ج ۷۵۔ ص ۲۴۶)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: **لَا يَنْبَغِيْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يَجْلِسَ مَجْلِسًا يُعْصَى اللّٰهُ فِيْهِ وَلَا يَقْدِرُ عَلٰى تَغْيِيْرِهٖ** (مومن کیلئے کسی ایسی محفل میں شرکت مناسب نہیں جس میں خدا کی نافرمانی ہوتی ہو اور وہ مومن اس محفل میں تغیر لانے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۳۷۴)

تاریخ میں ہے کہ دوسرے عباسی خلیفہ منصور دوانقی نے اپنے ایک بیٹے کی ختنہ کے موقع پر ایک پُرشکوہ شاہانہ محفل کا انعقاد کیا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کو بھی اس میں مدعو کیا' یہاں تک کہ آپ اس محفل میں شرکت پر مجبور ہو گئے۔ جب کھانے کا دسترخوان لگایا گیا تو اچانک امام کی نظر پڑی کہ دسترخوان پر شراب کے برتن بھی رکھے جا رہے ہیں۔ آپ یکلخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے' اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اس دسترخوان اور اس کے گرد بیٹھنے والوں کے بارے میں فرمایا: **مَلْعُوْنٌ مَنْ جَلَسَ عَلٰى مَائِدَةٍ يُشْرَبُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ** (ایسا شخص ملعون ہے جو کسی ایسے دسترخوان پر بیٹھے جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ فروعِ کافی۔ ج ۶۔ ص ۲۶۷)

نتیجہ اور خلاصہ

قرآنِ کریم' پیغمبر اسلام اور ائمہ معصومین کی تعلیمات و فرامین کی رو سے ہر مسلمان اس بات کا ذمے دار ہے کہ وہ حق کی تائید اور اسکی حفاظت و دفاع کیلئے کوشاں رہے' اور معاشرے کو خدا اور دینی باتوں کی طرف دعوت دے۔ اس فریضے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ کسی صورت جھوٹا گواہ نہ

بنے۔ یعنی نہ تو جھوٹی گواہی دے اور نہ گناہ کی تائید اور حوصلہ افزائی کا باعث بنے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کرو۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۲)

اس بات کی جانب متوجہ رہنا بھی ضروری ہے کہ جھوٹی گواہی کی صورتوں میں سے ایک صورت ساز و آواز اور گانے بجانے کی محفلوں میں شرکت ہے۔ جیسا کہ خوشی کی بعض محافل بالخصوص شادی بیاہ کی محفلوں میں معمول ہے۔ ایسی محفلوں میں حاضری اور اُن میں شرکت حرام ہے اور فسق و فجور کی تائید اور حرام اعمال کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہے۔ خدا کی نظر میں پسندیدہ بندے اس قسم کی محفلوں میں شرکت سے لازماً گریز کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک گفتگو کے دوران فرمایا: وَمَن لَم یَحکُم بِمَا اَنزَلَ اللّٰه کَانَ کَمَن شَهِدَ شَهادَةَ زورٍ ' وَیُقذَفُ بِهِ فِی النَّارِ وَیُعَذَّبُ بِعَذابِ شَاهِدِ زُورٍ (وہ شخص جو خدا کے نازل کئے ہوئے (قرآنِ مجید) کے مطابق فیصلہ نہ کرے جھوٹی گواہی دینے والے شخص کی مانند ہے۔ ایسے شخص کو دوزخ میں پھینکا جائے گا اور اُسے جھوٹی گواہی دینے والے کا عذاب دیا جائے گا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۶۔ ص ۳۶۷)

ایک حدیث میں ہے کہ عبدالاعلیٰ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا: یہ آیت جس میں فرمایا گیا ہے کہ: وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۰) اس سے کیا مراد ہے؟ امام نے فرمایا: الغنا (یعنی حرام موسیقی مراد ہے)۔ (بحار الانوار۔ ج ۷۹۔ ص ۲۳۵)

نیز امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہونے والی بہت سے روایات کے مطابق زیرِ بحث آیت "وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ" میں لفظ "زُوْر" سے مراد غنا (یعنی حرام موسیقی) ہے۔ اور اِن حضرات نے اس آیت کے ضمن میں فرمایا ہے کہ: خدا کے ممتاز بندے فاسقوں کی محافل میں شرکت اور باطل اور بیہودہ محفلوں میں حاضری سے پرہیز کرتے ہیں۔ (نور الثقلین۔ ج ۴۔ ص ۴۱)

فضول کاموں اور وقت کے زیاں کی مخالفت

قرآنِ مجید (سورۂ فرقان میں) عباد الرحمٰن کی دسویں خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے کہ: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (اور جب فضول کاموں کے قریب سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۷۲)

یہ خصوصیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ خدا کے خاص اور ممتاز بندے نہ صرف ہر قسم کی لغویات، فضول کاموں اور باطل امور کے خلاف ہوتے ہیں، اُن چیزوں کے خاتمے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، بلکہ اسکے ساتھ ساتھ لغویات اور باطل امور سے اپنی ناخوشی اور ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں اور سہل پسندی اور سستی وغیرہ کی وجہ سے کبھی بھی باطل کو قبول کرنے اور اسکی تائید و حمایت پر تیار نہیں ہوتے۔ ایک معقول ہدف اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے، اُن کی تمام حرکات و سکنات، اعمال و رفتار منطقی اور سنجیدہ ہوتے ہیں اور ان کے فکر و عمل میں کسی قسم کی فضولیات اور لغویات جگہ نہیں بنا پاتیں۔ کلی طور پر اُن کا یہ عمل نہی عن المنکر کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔

نہی عن المنکر جو ایک اہم دینی فریضہ ہے شدید مقابلے اور جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوبدو جنگ کا کوئی بھی راستہ کارگر ثابت نہیں ہو پاتا۔ ایسی صورت میں غیظ و غضب اور ناراضگی کے اظہار کے ذریعے سلبی جنگ کی راہ اپنانی پڑتی ہے۔ یہ طرزِ عمل اس

بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خدا کے ممتاز بندے باطل اور بدی کے ماحول سے کسی طرح کی خوشی اور رضامندی کا اظہار نہیں کرتے۔ بلکہ اِس کے خلاف ایک دوٹوک اور سنجیدہ قطعی موقف کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

لغو کے معنی ہیں بیہودہ' کھوکھلی اور فضول گفتگو۔ نیز یہ کتے کے بھونکنے' قسم کے توڑنے اور بے وجہ اور جھوٹی قسم کھانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (المنجد۔ لفظ لغو کے ذیل میں)۔ اِس بنیاد پر لغو سے مراد ہر قسم کے ایسے بے ہودہ' کھوکھلے اور بے اساس اعمال اور نقصاندہ اور بے مقصد سرگرمیاں ہیں' جو انسان کے وقت' اِس کی تعمیری قوتوں اور اِس کی عمر کے زیاں کا باعث ہوں۔ لہٰذا اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو وقت کے ضائع ہونے اور مواقع ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ بنتی ہے۔

قرآن وحدیث کی نگاہ میں لغو سے اجتناب

مذکورہ آیت کے علاوہ' قرآنِ مجید میں دو اور مقامات پر لغو سے اجتناب اور اس سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور اِس اجتناب اور دوری کو مومنین اور حق طلب افراد کی خصوصیات اور خصائل میں سے قرار دیا گیا ہے۔

مومنین کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (اور وہ لغو باتوں سے اجتناب کرنے والے ہیں۔ سورۂ مومنون ۲۳۔ آیت ۳) اور حق کے متلاشی افراد کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہے: وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (اور جب لغویات سنتے ہیں' تو اجتناب کرتے ہیں۔ سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۵۵)

قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے کہ بہشت ہر قسم کی لغویات اور بیہودگیوں سے پاک ہے اور وہاں سلامتی' شادمانی اور بہشتی نعمتوں کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا (۱)۔

یہ آیات اِس بات کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ اگر انسان اسی دنیا میں ایک جنت نظیر

۱۔ سورۂ طور ۵۲۔ آیت ۲۳' سورۂ مریم ۱۹۔ آیت ۶۲' سورۂ واقعہ ۵۶۔ آیت ۲۵' سورۂ نبا ۷۸۔ آیت ۳۵' سورۂ غاشیہ ۸۸۔ آیت ۱۱۔

معاشرہ بنانا چاہتے ہیں' تو اِس معاشرے کی ایک خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ ہر قسم کی لغویات اور فضولیات سے محفوظ اور پاک ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَعْظَمُ النَّاسِ قَدْراً مَنْ تَرَکَ مَالاً یَعْنِیْهِ (لوگوں میں با فضیلت ترین انسان وہ ہے جو بے معنی کاموں کو چھوڑ دے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۲۷۶)

نیز آپ نے فرمایا ہے: تَرْکُ مَا لَا یَعْنِیْ زِیْنَةُ الْوَرَعِ (لغو و بیہودہ کاموں کو چھوڑنا' پرہیزگاری کی زینت و زیبائی ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۳۱)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: اِیَّاکَ وَ الدُّخُوْلَ فِیْمَا لَا یَعْنِیْکَ فَتَذِلَّ (بے مقصد اور فضول کاموں میں پڑنے سے پرہیز کرو کیونکہ ایسے کاموں میں مشغول ہونا تمہاری ذلت و رسوائی کا موجب ہوگا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۲۰۴)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: رُبَّ لَغْوٍ یَجْلِبُ شَرّاً (بسا اوقات فضول کام بدی اور برائی کا موجب ہو جاتے ہیں۔ غرر الحکم۔ نقل از میزان الحکمۃ۔ ج ۸۔ ص ۵۱۴)

نیز آپ ہی کا ارشاد ہے: مَنِ اشْتَغَلَ بِالْفُضُوْلِ' فَاتَهُ مِنْ مُهِمَّةِ الْمَامُوْلِ (ایسا شخص جو اپنے آپ کو فضول اور بے مقصد کاموں میں مشغول کر لے' وہ قابلِ توجہ اہم کاموں کی انجام دہی سے محروم رہے گا۔ حوالۂ سابق)

امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں میں ہے کہ: وَعَمِّرْنِیْ مَا کَانَ عُمُرِیْ بِذْلَةً فِیْ طَاعَتِکَ' فَاِذَا کَانَ عُمُرِیْ مَرْتَعاً لِلشَّیْطَانِ فَاقْبِضْنِیْ اِلَیْکَ (بارِ الٰہا! جب تک میری زندگی تیرے فرامین کی بجا آوری میں بسر ہو رہی ہے' اُس وقت تک اُسے باقی رکھنا اور جب وہ شیطان کی چراگاہ بن جائے' تو میری روح قبض کر لینا۔ صحیفۂ سجادیہ۔ دعا ۲۰)

روایت کی گئی ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کے زمانے میں' مدینہ میں ایک مسخرہ رہا کرتا تھا' جو اپنی بے سروپا حرکات سے لوگوں کو ہنساتا تھا۔ بعض اوقات اُس نے اشارتاً کہا تھا کہ اس شخص (یعنی امام زین العابدین) نے مجھے زچ کر کے رکھ دیا ہے' میں نے ہر ممکن کوشش کر کے

دیکھ لی' مگر انہیں نہیں ہنسا سکا۔ ایک روز یہی مسخرہ امام زین العابدین کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا آیا اور آپ کے دوشِ مبارک سے آپ کی عبا اچک کر لے گیا۔ امام نے اُس کی اس حرکت پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن امام کی معیت میں چلنے والے لوگ دوڑے اور اُس کے ہاتھ سے عبا چھین کر امام کی خدمت میں واپس لے آئے۔ امام نے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ عرض کیا گیا: یہ مدینہ کا رہنے والا ایک مسخرہ ہے' جو اپنی اس قسم کی حرکتوں سے لوگوں کو ہنساتا ہے۔

امام نے فرمایا: اس سے کہو کہ: اِنَّ اللهِ یَوۡمًا یَخۡسَرُ فِیهِ الۡمُبۡطِلُوۡنَ (۱) (خدا کے پاس ایک دن ایسا ہے (قیامت) جس دن فضول کام کرنے والے لوگ نقصان اٹھائیں گے۔ مناقب آلِ ابی طالب۔ ج ۴۔ ص ۱۵۸)

لغویات اور فضولیات سے دور رہنے کے بارے میں موجود بے شمار روایات میں سے ہم نے جن چند منتخب روایات کو پیش کیا وہ اس موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان روایات کے ذریعے پیغمبر اسلام اور ائمۂ معصومین نے بیہودگی اور ہر قسم کے غیر مفید کاموں اور بے فائدہ سرگرمیوں سے دور رہنے کی تاکید کی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ یہ روایات اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ وقت اور مواقع انتہائی قدر و قیمت کی حامل شئے ہیں' انہیں باطل امور اور بے فائدہ کاموں میں تلف نہیں کرنا چاہئے۔

وقت کی پہچان اور اسکی قدر

فضولیت کی جانب رجحان اور بے معنی اور بے مقصد زندگی انتہائی نقصان دہ چیز ہے' جو انسان کی شخصیت اور اعلیٰ انسانی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ کر برباد کر دیتی ہے' انسان کو نہ صرف ترقی و تکامل سے روکتی ہے' اُسے اُس کی حقیقت سے دور کر دیتی ہے بلکہ اُس کے زوال' انحطاط اور ہلاکت کا باعث بھی بن جاتی ہے۔

اس ضرر رساں چیز کا ایک انتہائی نمایاں اثر یہ ہے کہ یہ انسان کے قیمتی وقت کے زیاں

۱۔ جملہ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ سورۂ غافر ۴۰ کی آیت ۷۸ میں آیا ہے۔

کا سبب بن کر اسے اس کے اصل سرمائے یعنی وقت کے گوہر گراں قیمت سے محروم کر دیتی ہے۔ لہٰذا بے مقصدیت کی مخالفت اور ہر قسم کے لغو امور سے پرہیز' وقت کے قیمتی سرمائے کی حفاظت اور اس سے بہترین نتائج کے حصول کا باعث ہے۔

اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اسلام اور عقل و دانش' دونوں ہی ''وقت'' کی انتہائی قدر و قیمت کے قائل ہیں' وقت کا صحیح اور بہترین استعمال زندگی کے مختلف میدانوں میں ترقی اور کمال کی وجہ بنتا ہے۔

اسلام میں وقت کی قدر جاننے' اس کو اہمیت دینے اور اس سے صحیح صحیح اور بجا استفادے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے' اور اسے خدا کی عظیم نعمت شمار کیا گیا ہے' جس کا روزِ قیامت حساب لیا جائے گا۔ جیسا کہ رسولِ کریم نے فرمایا ہے: روزِ قیامت انسان ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے گا' جب تک اس سے ان چار چیزوں کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے: اُس کی عمر کے بارے میں کہ اسے کس راہ میں بسر کیا۔ اُس کے جسم (یا جوانی) کے بارے میں کہ اسے کن امور میں صرف کیا۔ اُس کے مال و دولت کے بارے میں کہ اسے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور میری اور میرے اہلِ بیت کی محبت کے بارے میں۔ (بحار الانوار۔ ج ۳۶۔ ص ۷۹)

اس روایت کی رو سے قیامت کے دن خدا کا سب سے پہلا سوال عمر' یعنی انسان کی زندگی کے اوقات کے بارے میں ہوگا' کہ انہیں کس راہ میں صرف کیا اور اُن کے عوض کیا حاصل کیا؟ فضول اور باطل امور میں خرچ کیا؟ یا حصولِ علم و کمال' تقویٰ اور مثبت کاموں کے لئے اُن سے کام لیا؟

انسانی زندگی کی گزرتی ساعتوں کو وقت کہتے ہیں۔ معروف عالم ''فخر الدین رازی'' کے بقول وقت' برف کی مانند ہے' جو پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر۔ ج ۱۰۔ سورۂ عصر کی تفسیر کے ذیل میں)۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس سے بہترین استفادہ کیا جائے' اس سے خوشگوار مشروبات ٹھنڈا کیا جائے' پیاسوں کو سیراب کیا جائے اور اس کے ذریعے کھانے پینے کی اشیا کو خراب ہونے سے بچایا جائے۔

لیکن اگر برف کو سخت گرمی میں پتھریلی زمین پر رکھ دیا جائے' تو وہ بغیر کوئی فائدہ پہنچائے پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اِسے نشہ آور مشروبات ٹھنڈا کرنے کے لئے استعمال کرے' جو انسان کے فہم وادراک' عقل وخرد کی تباہی کا باعث بنیں۔

لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ منظم پروگرام کے ذریعے فضول کاموں اور کھوکھلے اور بے فائدہ امور سے سختی کے ساتھ پرہیز کریں' تا کہ اپنی زندگی کے ایک ایک سیکنڈ' ایک ایک منٹ اور ایک ایک گھنٹے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ اِس بارے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: مومن اپنے شب و روز کے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک حصے کو اپنی زندگی کے امور کی اصلاح اور تلاشِ معاش میں صرف کرتا ہے۔ دوسرے حصے کو آرام واستراحت' حلال لذتوں سے استفادے اور قوت جمع کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور تیسرے حصے کو خدا سے راز و نیاز اور اپنے اور خدا کے درمیان معاملات کی اصلاح (خود سازی اور مختلف شعبوں میں تعمیر) کے لئے کام میں لاتا ہے۔ (اقتباس از نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۳۹۰)

وقت کی قدر اور اہمیت کے بارے میں یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ بعض مفسرین نے آیۂ والعصر کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہاں عصر (جس کی خدا نے قسم کھائی ہے) سے مراد وقت ہے۔ یعنی وقت کی قسم!!!! کیونکہ اگر اِس سے بہتر استفادہ کیا جائے' تو یہ انسان کے لئے بے مثل سرمایہ ہے۔ اور اِس سے بہترین استفادے کے لئے ضروری ہے کہ انسان فضولیات اور بے کار اور منفی کاموں سے دور رہے۔

اگر ہم وقت کو لغو کاموں اور منفی امور میں برباد کرنے کی بجائے اس سے صحیح اور درست استفادہ کریں' تو اِس طرح ہم اپنے قیمتی وقت کو تباہ اور ضائع نہیں کریں گے۔ اور اگر ایسا نہ کر سکیں' تو ہمیں آخر عمر میں اور روزِ قیامت غم واندوہ کے سوا کوئی اور نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ جیسا کہ اِس بارے میں قرآنِ مجید فرماتا ہے کہ: وَ اتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ (اور تمہارے رب کی طرف سے جو بہترین قانون

نازل کیا گیا ہے اُس کا اتباع کرو' قبل اسکے کہ تم تک اچانک عذاب آ پہنچے اور تمہیں اِس کا شعور بھی نہ ہو۔ پھر تم میں سے کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ ہائے افسوس میں نے خدا کے حق میں بڑی کوتاہی کی ہے اور میں (آیاتِ الٰہی کا) مذاق اڑانے والوں میں سے تھا۔ سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۵۵'۵۶)

قابلِ توجہ بات ہے کہ قرآنِ کریم میں دو الفاظ ''لہو'' اور ''لعب'' بار بار استعمال ہوئے ہیں اور ان سے پرہیز کی تلقین کی گئی ہے۔ لہو ولعب (جن کے معنی عیاشی' غافل کر دینے والے اور منفی اثرات کے حامل کھیل کود ہیں) اُن عوامل میں سے ہیں جو انسان کو لغو اور فضول کاموں میں مصروف کر دینے کا باعث ہوتے ہیں۔

ہم لہو ولعب سے پرہیز کے بارے میں قرآنِ کریم کی ہدایت سے یہ نکتہ بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ اِن سے پرہیز' وقت کی قدر کرنے اور اِس سے مفید استفادے کا بہترین ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فضولیت کی جانب رجحان سے جو نقصانات بشریت کو اٹھانا پڑے ہیں (جن کی ایک شکل لوگوں کا منشیات کا عادی ہونا ہے) وہ خطرناک اور انتہائی بڑی خسارتیں ہیں۔

وقت کی قدر اور لغویات سے پرہیز کے خوبصورت نتائج

وقت کی قدر کرنے والا انسان نہ صرف اپنی آخرت کی کامیابی کا بندوبست کر سکتا ہے اور معنویت کے بلند درجات پر پہنچ سکتا ہے بلکہ اِس دنیا میں بھی علم وعمل کے میدانوں میں کمال کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور ایک عالمی شخصیت بن کر بشریت کو اپنی قیمتی خدمات سے فیضیاب کر سکتا ہے۔ اگر ایڈیسن نے بجلی دریافت کی اور بہت سی دوسری مفید دریافتوں کا سبب بنا' اگر بوعلی سینا نے علمِ طب اور فلسفے اور عرفان کو وسعت اور گہرائی دی اور اگر آئن اسٹائن نے فزکس کو رونق بخشی اور اسکے تجزیے اور تحلیل کی وسعت میں اضافہ کیا اور بہت سے دوسرے لوگ جو مختلف میدانوں میں علوم کی وسعت وترویج اور صلاحیتوں میں اضافے کا سبب بنے' تو یہ سب کچھ وقت سے صحیح استفادے کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ اپنے بہترین وقت کو لغو اور فضول کاموں میں گزار دیتے' تو اِس سے خود اُن کی اور اُن کے معاشروں کی تباہی کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔

ہم خود اپنے اردگرد اپنے بزرگ علما کو دیکھتے ہیں' جنہوں نے اپنے وقت سے استفادے

اور فضولیات سے پرہیز کے ذریعے عالی ترین درجات حاصل کئے اور معاشرے کے لئے عظیم الشان علمی اور عملی خدمات انجام دیں اور اُس کے لئے برکات وثمرات کا باعث ہوئے۔ اِس سلسلے میں ہم آپ کی توجہ کے لئے اختصار کے ساتھ چار علما کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ آیت اللہ العظمیٰ شیخ محمد حسن نجفی علیہ الرحمہ المعروف صاحب جواہر (وفات ۱۲۶۶ھ) جنہوں نے اپنی یادگار کے طور پر استدلالی فقہی کتاب ''جواہر الکلام'' چھوڑی ہے' جو چالیس سے زیادہ جلدوں پر مشتمل ہے اور جس میں تمام ابواب فقہ شامل ہیں۔ ان بزرگوار نے اپنے وقت سے بہترین استفادہ کیا اور اِس میں ممتاز شاگردوں کی تربیت کی اور گراں قدر کتاب جواہر الکلام تالیف کی جو اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے شیعہ استدلالی فقہ میں بے نظیر حیثیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر فقہ شیعہ کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے' ٹھیک اُسی طرح جیسے علامہ مجلسی علیہ الرحمہ کی کتاب ''بحار الانوار'' احادیث معصومین کا دائرۃ المعارف اور خاندانِ رسالت کے علوم ومعارف پر مبنی ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہے۔

مرحوم صاحب الجواہر کی ولادت تقریباً ۱۱۹۲ھ میں ہوئی۔ ۲۵ برس کی عمر میں آپ نے ''جواہر الکلام'' کی تالیف کا آغاز کیا اور ۱۲۵۷ھ میں اسے مکمل کیا۔ یعنی آپ نے بغیر کسی وقفے کے اس کتاب کو ۴۰ سال میں تحریر کیا اور یہ عظیم توفیق حاصل کی۔ آپ نے ۱۲۶۶ھ میں ۷۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اِس کتاب کے علاوہ بھی آپ نے دوسری کتب تالیف کیں' جن میں نجاۃ العباد' ہدایۃ الناسکین اور علم اصول پر ایک کتاب بھی شامل ہے۔ بعض علما کے بقول اگر صاحب جواہر کے دور کا کوئی تاریخ نویس اُس دور کے حیرت انگیز واقعات قلمبند کرتا' تو اُسے کتاب جواہر الکلام کی تالیف سے زیادہ حیرت انگیز کوئی اور واقعہ نہ مل پاتا۔ (جواہر الکلام۔ طبع بیروت۔ ج ۱۔ ص ۱۲' ۱۴' ۱۷ اور ۲۴ مقدمہ)

غور سے پڑھیے۔ شیخ محمد حسن نجفی علیہ الرحمہ کا ایک بہت پیارا فرزند' جس کا نام حمید تھا' اُس کا انتقال آپ کی حیات ہی میں ہوگیا تھا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ شیخ کو اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل اور زندگی کے امور میں بہتری کے لئے اِس بیٹے کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ شیخ اپنے اِس

فرزند کے جنازے پر آئے اور چند آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی۔ ابھی جنازے کو تدفین کے لئے تیار ہونے میں کچھ وقت تھا۔ یہ دیکھ کر شیخ وہیں بیٹھ گئے' اپنا بستہ کھول کر اس میں سے قلم و کاغذ نکالا اور کتاب جواہر الکلام (جسے اُس زمانے میں وہ تحریر کر رہے تھے) لکھنے میں مصروف ہوگئے۔

وقت کی اہمیت اور اِس سے زیادہ سے زیادہ استفادے کے سلسلے میں شیخ کا یہی طرزِ عمل تھا جس کے ذریعے آپ نے فقہ وفقاہت کے میدان میں ایسی گرانقدر کتاب پیش کی۔ امام خمینی نے اپنے ایک بیان میں اِس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

۲۔ مرجع اعظم حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردی علیہ الرحمہ اپنی جوانی میں حوزۂ علمیہ اصفہان میں تحصیل علم میں مشغول تھے۔ کبھی کبھی آپ رات کے وقت مطالعے میں ایسے غرق ہوجاتے کہ صبح موذن کی اذان ہی آپ کو وقت گزرنے کا احساس دلاتی۔ یہ ترقی اور کمال کے لئے وقت سے استفادے کی ایک اور مثال تھی۔

۳۔ ابوریحان البیرونی (متوفی ۴۳۰ھ) کا شمار ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ یہ بوعلی سینا کے ہم عصر تھے اور علمِ طب اور ریاضی وغیرہ میں اپنے زمانے کے چوٹی کے علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے مختلف علوم کے حصول کے لئے اُس دور میں دور دراز علاقوں کے سفر کئے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کیں' کثیر علمی سرمایہ اکٹھا کیا اور علم کے اعلیٰ درجات تک پہنچے۔ وقت کی قدر کے سلسلے میں کم ہی لوگ اُن کی مثل ہوں گے۔ وہ اپنی عمر کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھتے تھے' دیکھا کرتے تھے کہ کہیں وہ فضول اور باطل امور میں برباد تو نہیں ہو رہا۔ اِن کے حالاتِ زندگی میں تحریر کیا گیا ہے کہ: ہمیشہ قلم ان کے ہاتھ میں رہتا تھا' مسلسل غور وفکر میں غرق رہتے تھے' عید نوروز اور عید مہرگان (ایرانی سال کے مہینے مہر کے پہلے دن) کے سوا پورے سال کام اور تحقیق میں مصروف رہا کرتے تھے۔

تعجب انگیز قصہ ہے کہ جب وہ بسترِ مرگ پر تھے' تو ان کا ایک شاگرد احوال پرسی کے لئے ان کے یہاں آیا۔ اس موقع پر بھی انہوں نے ریاضی کے ایک مسئلے ''حساب جدات'' کے بارے میں اس سے گفتگو کی۔ اس شاگرد نے ان سے کہا کہ آپ اس حال میں بھی ریاضی کے مسائل پر

گفتگو کر رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: میری نظر میں اس مسئلے سے آگاہی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونا' اس سے ناواقفیت کے ساتھ دنیا سے گزر جانے سے بہتر ہے۔ شاگرد کہتا ہے کہ میں نے اس مسئلے کی وضاحت کی' اس کے بعد ان سے رخصت چاہی' ابھی میں اپنے گھر بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ منادیوں نے خبر دی کہ ابوریحان کا انتقال ہو گیا ہے۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۵۳۸)

۴۔ عظیم فلسفی ملا ہادی سبزواری' جو تیرہویں صدی ہجری کے بڑے فلاسفہ اور حکما میں شمار کیے جاتے ہیں اور جو ایران اور اسلام کے لئے باعثِ افتخار لوگوں میں سے ہیں' انہوں نے اپنی جوانی میں حوزۂ علمیہ اصفہان سے تعلیم حاصل کی۔ آپ وقت کو اِس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اپنے وطن سے آنے والے خطوط تک کو کھول کر نہیں پڑھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں کوئی ایسی ناگوار خبر ہو جو ان کے ذہن کو اپنی طرف مشغول کر لے اور اس کی وجہ سے اُن کی پڑھائی کا نقصان ہو جائے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد' جب انہوں نے وطن واپسی کا ارادہ کیا' تو اِن خطوط کو کھول کر پڑھا۔ ان میں سے ایک خط میں اُن کے ایک قریبی رشتے دار کی موت کی خبر تھی۔ یہ دیکھ کر علامہ سبزواری نے کہا کہ: خدا کا شکر ہے کہ جب مجھے یہ خط ملا تھا اُس وقت میں اِس ناگوار خبر سے مطلع نہ ہوا۔ کیونکہ یہ میری تعلیم کے لئے نقصان کا باعث ہوتا۔ (تاریخ فلاسفۂ اسلام۔ ج ۲۔ ص ۱۵۳)

حضرت امام خمینی علیہ الرحمہ بھی اِن عظیم افراد میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے ہر پہلو میں تنظیم اور نظم وضبط کے ذریعے وقت سے بہترین استفادہ کیا اور ہر قسم کی لغویات اور فضولیات سے پرہیز کے ذریعے عظیم دنیوی اور اُخروی فوائد حاصل کئے۔ انہوں نے اپنے ایک کلام میں فرمایا ہے: ہمیشہ قلیل منظم گروہ نے کثیر غیر منظم گروہ پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ (صحیفۂ نور۔ ج ۱۴۔ ص ۱۷۸)

مقالے کی اختتامی سطور کو ہم امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اِس پُر معنی کلام سے زینت بخشتے ہیں۔ امام نے اپنی ایک گفتگو کے دوران فرمایا: سخت ترین غم واندوہ' فرصت اور مواقع کا ہاتھ سے نکل جانا ہے۔ (غرر الحکم۔ ج ۲۔ ص ۴۴۱)

قرآنِ کریم سے درست استفادہ

قرآنِ کریم خداوند عالم کے خاص اور ممتاز بندوں کی گیارہویں امتیازی خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے: وَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (اور جب ان لوگوں کو آیاتِ الٰہی کی یاد دلائی جاتی ہے تو بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے ہیں۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۷۳)

یہ خصوصیت' خدا کے ممتاز بندوں کی اہم ترین خصوصیت اور سب سے بڑی نشانی ہے۔ وہ قرآنِ کریم سے' اس عظیم ترین آسمانی کتاب اور پیغمبر اسلام کے یگانہ دائمی معجزے سے گہرا اور مضبوط نظری اور عملی تعلق رکھتے ہیں اور اُن کا یہ تعلق اس قدر موثر ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات اُن کے طرزِ عمل میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے اسی اور اسی طرح کی دوسری آیاتِ قرآنی کی بنیاد پر فرمایا ہے کہ: قرآن کے قاری تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ لوگ جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اسے مادّی امور کے حصول کا وسیلہ اور بادشاہوں سے تعلقات کے قیام کا ذریعہ بناتے ہیں' اور اس کے ذریعے لوگوں کے سامنے اپنی بڑائی جتاتے اور خودنمائی کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے قاری وہ ہوتے ہیں جو تلاوت کے دوران حروف (اور تجوید) کی حفاظت کرتے ہیں' لیکن اسکے حدود و قوانین کو قدموں تلے روندتے ہیں۔ خداوند عالم ایسے لوگوں میں اضافہ نہ کرے۔ تیسری قسم کے

قاریانِ قرآن وہ ہیں جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن کی دوا سے اپنے بیمار دل کا علاج کرتے ہیں (اور قرآن کو اپنی روحانی بیماریوں کے علاج کا ذریعہ بناتے ہیں) اسکے ساتھ شب بیداری کرتے ہیں اور دن کو تشنگی (روزے کی حالت) میں بسر کرتے ہیں... قوالله لهولاء فی قُرّاء القرآنِ اعزُّ مِنَ الکبریتِ الاحمرِ (اور خدا کی قسم قرآن کے قاریوں کے درمیان اس قسم کے لوگ سرخ گندھک سے بھی زیادہ کمیاب ہیں۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۶۲۷)

جب ہم قرآنِ مجید سے تعلق کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں' تو (نادر مقامات کے سوا) مجموعی طور پر یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ قرآن کے مقابل ہماری دو ذمے داریاں ہیں۔ ایک' قرآنی تعلیمات سے آگہی اور دوسرے' ان تعلیمات پر عمل۔

اس نکتے کی وضاحت میں عرض ہے کہ قرآنِ مجید میں لفظ "قرآن" اسی صورت میں ۶۵ مرتبہ استعمال ہوا ہے' جبکہ "کتاب" کے عنوان سے دسیوں مرتبہ اسکا ذکر ہوا ہے۔ وہ آیات جن میں قرآن کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے' انہیں دیکھیں تو اُن میں سے اکثر میں قرآن سے شناسائی' اسکی تعلیمات جاننے اور پھر قرآنی احکام پر عمل کی تاکید موجود ہے۔ جیسے کہ زیرِ بحث آیت (سورۂ فرقان کی آیت ۷۳) میں انتہائی انداز میں اس نکتے کی جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید سے آپ کا تعلق اندھوں بہروں کا سا تعلق نہیں ہونا چاہئے' بلکہ کھلی آنکھوں اور سنتے کانوں کے ساتھ قرآن پر توجہ دیں' اس سے اچھی طرح شناسائی حاصل کریں اور اپنی روح کو قرآنِ مجید کے صاف شفاف پانی سے پاک کریں۔

روایت میں آیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک شاگرد ابوبصیر نے امام سے مذکورہ آیت کی وضاحت چاہی تو امام نے فرمایا: مستبصرینَ لَیسُوا بِشَکاکٍ (بصیرت اور معرفت کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرو' اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرو۔ روضۃ الکافی۔ ص ۱۷۸۔ حدیث ۱۹۹)

لہٰذا نظری اعتبار سے قرآن کو پہچاننا اور اسکے احکام و تعلیمات پر یقین رکھنا خدا کے ممتاز بندوں کی ایک خصوصیت ہے۔

قرآنِ مجید کی اور دوسری آیات میں بھی مذکورہ بالا دو ذمے داریوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مزید وضاحت کے لئے چند آیات کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

☆۔ پہلی ذمے داری (قرآن سے شناسائی) کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ:

"اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا."

"تو کیا یہ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے' یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔" (سورۂ محمد ۴۷۔ آیت ۲۴)

یہ آیت زور دے کر ہمیں قرآنی احکام و تعلیمات سے آگہی اور اُن میں غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے۔

نیز ارشادِ الٰہی ہے:

"وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ."

"اور ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے' تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟" (سورۂ قمر ۵۴۔ آیت ۱۷)

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خداوند عالم نے قرآنِ مجید کو آسان اور رواں زبان میں نازل کیا ہے۔ تاکہ سب لوگ اس سے شناسائی حاصل کر سکیں اور اس شناسائی کا مقصد نصیحت حاصل کرنا' متنبہ ہونا' سیکھنا اور عمل کرنا ہے۔

ارشادِ پروردگار ہے:

"وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ."

"(اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے' تو خاموش ہو کر غور سے سنو' شاید اس طرح خدا کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو جائے۔"

(سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۲۰۴)

یہ آیت بتاتی ہے کہ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے موقع پر خاموشی اور ان کی جانب توجہ فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔ اور قرآن کے بارے میں بہترین ادب یہ ہے کہ جب اسکی تلاوت کی جائے تو

مکمل یکسوئی کے ساتھ اسے سنا جائے اور اپنی روح کو قرآنِ کریم کی ظاہری اور باطنی خوشبو سے معطر کیا جائے۔

☆۔ قرآنِ کریم کے حوالے سے دوسری ذمے داری (اس پر عمل) کے بارے میں قرآن کی چند آیات کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں:

قرآن فرماتا ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔"

"صاحبانِ ایمان درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کے سامنے خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو۔ اور اسکی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ اور وہ لوگ صرف اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں۔"

(سورۂ انفال ۸۔ آیت ۲)

جی ہاں، مومنین کا دل قرآنِ مجید کے سامنے ایسے ہی خاشع اور خوفزدہ ہوتا ہے۔ آیاتِ قرآنی سننے سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ خدا سے ان کے تعلق کی مضبوطی کا باعث بنتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔"

"اے لوگو! تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا کا سامان اور ہدایت اور صاحبانِ ایمان کے لئے رحمت، قرآن آچکا ہے۔"

(سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۵۷)

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

"کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔"

"یہ کتاب ہے، جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے، تاکہ آپ لوگوں کو خدا کے حکم سے (شرک اور جہل) کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان اور علم و آگہی کے) نور کی طرف لے آئیں۔" (سورۂ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۱)

قرآنِ مجید میں غور وفکر اور اس پر عمل حضرت علی کی نظر میں

نہج البلاغہ میں بہت سی جگہوں پر قرآنِ مجید سے شناسائی اور اسکے احکام پر عمل اور ان کے اجراء و نفاذ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ بطور مثال چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

امام فرماتے ہیں: وَتَعَلَّمُوا القرآنَ فانّهُ أحسنُ الحديثِ، و تفقّهوا فيهِ فانّهُ رَبيعُ القُلوبِ وَاستشفُوا بنورهِ فانّهُ رَبيعُ القُلوبِ وَاستشفُوا بنورهِ فانّهُ شفاءُ الصّدورِ

(قرآن کی تعلیم حاصل کرو، کہ یہ بہترین کلام ہے۔ اور اس میں غور وفکر کرو، کہ یہ دلوں کی بہار ہے۔ اور اسکے نور سے شفا طلب کرو، کہ یہ دلوں کی شفا ہے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۱۰)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: تالينَ الاجزاء القرآن يُرتلوا ترتيلاً يحزنونَ بهِ أنفسهم، و يستبشرونَ بهِ دواءَ دائهم، فاذا مرّوا بآيةٍ تشويق رَكنُوا اليها طمعاً و تطلّعتْ نفوسُهُم اليها شوقاً وظنّوا انّها نُصبَ اعيُنِهم، واذا مرّوا بآيةٍ فيها تخويفٌ أصغَوا اليها مسامعَ قلوبِهم، وظنّوا أنّ زفيرَ جهنّمَ وشهيقها في أصولِ آذانِهم۔

(پرہیزگار وہ لوگ ہیں جو ٹھہر ٹھہر کر اور غور وفکر کے ہمراہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، اسکے ساتھ اپنی روح کو محزون کرتے ہیں اور اس سے اپنے درد کی دوا حاصل کرتے ہیں۔ جب بھی کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں شوق دلایا گیا ہو، تو اشتیاق کے ساتھ اسکا سامنا کرتے ہیں اور ان کی روح انتہائی شوق کے ساتھ خیرہ ہو جاتی ہے اور اسے ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور جب کبھی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں خوف دلایا گیا ہو، تو اسے سننے کے لئے اپنے دل کے کانوں کو کھول دیتے ہیں اور نالہ و فغاں کی آوازیں اور دوزخ کے لپکتے شعلے اپنی ہولناکی کے ساتھ ان کے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۳)

یہ عبارتیں انتہائی واضح الفاظ میں ہمیں اپنی دو ذمے داریوں (یعنی قرآنِ مجید سے شناسائی

اوراس کے احکام پر عمل) کی دعوت دیتی ہیں اور یہ بیان کرتی ہیں کہ آیاتِ قرآنی کو ہمیشہ مومنین کے دل پر اثر انداز ہونا چاہئے اور ان میں فکری اور عملی تبدیلیوں کا باعث بن کر ان کی ترقی اور ارتقا کا ذریعہ بننا چاہئے۔ بصورتِ دیگر قرآن ہمارے لئے ایک غیر موثر کتاب ہو کر رہ جائے گی بلکہ بعض اوقات (خدا نہ کرے) ہمارے لئے نقصان کا باعث ہو جائے گی۔ جیسا کہ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ: وَ لَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا (اور ظالمین کے لئے خسارے میں اضافے کے سوا کچھ اور نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۸۲) بالکل اسی طرح جیسے بارش کے قطرات باغ کو تر و تازہ کردیتے ہیں، جبکہ کیچڑ میں پڑ کر اسکی گندگی کو اور بڑھا دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم سے ایسا ہی شخص استفادہ کرسکتا ہے جس نے تقویٰ اور پرہیز گاری کا پختہ عزم کر رکھا ہو اور جس کا وجود جہل، شرک، ظلم اور نفاق سے آلودہ نہ ہو۔ کیونکہ یہ رذیلہ صفات اس بات کا باعث ہو جاتی ہیں کہ ان کا حامل شخص نہ صرف نورِ قرآن کی جانب مائل نہیں ہوتا، بلکہ چمگادڑ کی طرح اس نور سے لڑنے لگتا ہے۔ مثلاً اگر ایک عالم مجاہد اور مبارز دانشور کو ایک قوت بخش غذا دی جائے تو وہ تعلیم و تربیت اور راہِ حق میں جہاد کی خاطر اس سے قوت حاصل کرے گا۔ لیکن اگر یہی مقوی غذا کسی ظالم و جابر کو دیں، تو وہ اس سے حاصل ہونے والی قوت کو مزید ظلم و ستم کے لئے استعمال کرے گا۔ فرق غذا کا نہیں ہے بلکہ شخصیتوں اور طرزِ تفکر کا فرق ہے۔

نتیجہ یہ کہ قرآن اپنی تعلیمات قبول کرنے پر آمادہ و تیار لوگوں کے لئے نہ صرف ایک دائمی شفا بخش نسخہ ہے، بلکہ تمام انفرادی و اجتماعی اور اخلاقی اور دوسرے امراض کے لئے ایک موثر دوا بھی ہے۔ ایک ایسی شفا بخش دوا ہے، جو تمام بیماریوں کا علاج کرکے زیبائی، اعتدال اور سلامتی پیدا کرتی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک روز قرآنِ کریم سے صحیح صحیح استفادہ کرنے والے اپنے شہید اصحاب عمار یاسر، ابن تیہان اور ذوالشہادتین وغیرہ کا ذکر اپنے بھائیوں کے عنوان سے کیا اسکے بعد ان کی جدائی کے غم میں اپنی ریش مبارک کو ہاتھ میں لے کر بہت دیر تک جاں سوز انداز میں گریہ کیا اور پھر فرمایا: اَوِہ عَلٰی اِخْوَانِیَ الَّذِیْنَ تَلَوُاالْقُرآنَ فَاَحْکَمُوْہُ. (ان بھائیوں کے دیدار پر حسرت و آہ کہ جنہوں نے قرآن کی تلاوت کی، اس (کی تعلیمات) پر کاربند ہوئے اور اس (کے احکام) پر اپنی زندگیوں کو استوار کیا۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۸۲)

امام نے اس گفتگو میں اپنے ان اصحاب کی چھ خصوصیات کی جانب اشارہ کیا اور ان کی پہلی خصوصیت کے طور پر قرآنِ مجید سے ان کے گہرے فکری اور عملی تعلق کا ذکر کیا۔ لہٰذا امیر المومنین کی نگاہ میں ممتاز اور بہترین مسلمان ایسا شخص ہے جس کا قرآن کے ساتھ عمدہ اور گہرا رابطہ ہو۔

قرآنِ کریم سے صحیح استفادے کی چند مثالیں

جب سے قرآن نازل ہوا ہے، اُس وقت سے اب تک ایسی ہزارہا مثالیں ملیں گی جن میں لوگوں میں قرآنِ کریم کی گہری تاثیر کے تحت اور اس سے شعوری اور عملی استفادے کے ذریعے فکری اور عملی انقلاب پیدا ہونے، ان کے ایک نیا جنم لینے اور نورِ قرآن کے زیرِ سایہ ان کے اپنی روح سے ہر قسم کی تاریکیوں کو دور کرنے کا ذکر ہے۔ یہاں ایسی ہی چند مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں:

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبادت کے لئے اٹھے اور آپ نے وہ پوری رات یہ آیت دہراتے اور اس کے بارے میں غور و فکر کرتے بسر کی کہ: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (اگر تو ان پر عذاب کرے گا، تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر معاف کردے گا، تو تو صاحبِ عزت بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۱۱۸) (یعنی نہ تیرا عذاب دینا بے حکمتی کی علامت ہے اور نہ تیرا بخش دینا تیرے ضعف کی نشاندہی)

آنحضرت اس رات صبح ہونے تک مسلسل یہی آیت دہراتے رہے۔ (المحجۃ البیضاء۔ ج ۲۔ ص ۲۳۷)

۲۔ اُمِ عقیل ایک بادیہ نشین مسلمان خاتون تھیں، جو قرآنِ کریم سے انتہائی بہترین تعلق رکھتی تھیں۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں کھانا پکانے اور دوسرے گھریلو کاموں میں مشغول تھیں کہ انہیں مطلع کیا گیا کہ ان کا ایک بیٹا گھر کے باہر اونٹ سے گر کر مر گیا ہے۔ اس دن ان کے یہاں دو مہمان آئے

ہوئے تھے۔ اُمِ عقیل نے یہ سوچ کر کہ کہیں مہمانوں کو تکلیف نہ ہو انہیں اس خبر سے مطلع نہیں کیا' ان کی خاطر مدارت میں لگی رہیں اور انہیں کھانا پکا کے دیا۔ جب کھانے کے بعد ان مہمانوں کو یہ بات پتا چلی تو وہ اُم عقیل کی عالی ہمتی پر متعجب ہوئے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد کچھ لوگ تسلیت کے لئے اُم عقیل کے پاس آئے' تو اُمِ عقیل نے اُن سے کہا: کیا تم میں سے کوئی شخص آیاتِ قرآنی کے ذریعے مجھے تسلیت کر سکتا ہے' اور میرے دل کو قرار دے سکتا ہے؟ یہ سن کر حاضرین میں سے ایک نے اِن آیاتِ قرآنی کی تلاوت فرمائی: وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (اور اُن صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں جو مصیبت پڑنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں' کہ ان کے لئے پروردگار کی طرف سے صلوات اور رحمت ہے' اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷)

یہ آیات سننے کے بعد اُمِ عقیل کے دل کو قرار آ گیا' اُن کا اضطراب سکون و اطمینان میں بدل گیا' وہ یکلخت اٹھیں' وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور نماز کے بعد اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور انتہائی عاجزی اور خاص تسلیم کے ساتھ عرض کیا کہ: بارالہا! مجھ تک تیرا فرمان پہنچا' میں نے اسے قبول کیا' اب میں صبر کر رہی ہوں' تو بھی مجھے وہ جزا عنایت فرما جس کا تو نے صابروں سے وعدہ کیا ہے۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۲۔ ص ۷۔ لفظ صبر کے ذیل میں)

جی ہاں! یہ ہوتی ہے قرآنِ مجید سے اُنسیت اور یہ ہے اس کی تعلیمات پر عمل' جس کے ذریعے انسان کی شخصیت میں تغیر اور اسکی فکر میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور جو انسان کو ناگوار حوادث کے سامنے صابر اور ثابت قدم رکھتی ہیں۔

۳۔ ایک دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِن آیات کی تلاوت فرما رہے تھے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلٰفِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا

خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ کَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (بے شک زمین اور آسمانوں کی خلقت' لیل و نہار کی آمد و رفت میں صاحبانِ عقل کے لئے قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اٹھتے بیٹھتے لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں' کہ خدایا! یہ سب تو نے بیکار نہیں پیدا کیا ہے' تو پاک و بے نیاز ہے' ہمیں عذابِ جہنم سے محفوظ فرما۔ پروردگار' تو جسے جہنم میں ڈال دے گا' گویا اسے ذلیل و رسوا کر دیا اور ظالمین کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ پروردگار' ہم نے اس منادی کو سنا جو ایمان کی آواز لگا رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ' تو ہم ایمان لے آئے۔ پروردگار' اب ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری برائیوں کی پردہ پوشی فرما' اور ہمیں نیک بندوں کے ساتھ محشور فرما۔ پروردگار' جو تو نے اپنے رسولوں سے وعدہ کیا ہے اسے عطا فرما' اور روزِ قیامت ہمیں رسوا نہ کرنا کہ تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۹۰ تا ۱۹۴)

اس کے بعد آپ نے فرمایا: وَیْلٌ لِّمَنْ لَا کَهَا بَیْنَ فَکَّیْهِ وَلَمْ یَتَاَمَّلْ فِیْهَا (وائے ہو اس پر جو ان آیات کو اپنے دہان میں گردش دے اور پھرائے لیکن ان پر غور و فکر نہ کرے۔ مجمع البیان۔ ج ۲۔ ص ۵۵۴)

۴۔ اسلام کے عظیم مفسر' شہید راہِ خدا سعید بن جُبیر ایک رات' ابتدائے شب سے صبح دم تک اسی ایک آیت کی تلاوت فرماتے' اس پر غور و فکر کرتے اور گریہ کرتے رہے۔ یہ آیت جس میں قیامت کے دن ندائے الٰہی کا ذکر ہے: وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (اور اے مجرمو! آج تم ذرا ان سے الگ تو ہو جاؤ۔ سورۂ یٰسین ۳۶۔ آیت ۵۹)

۵۔ فضیل بن عیاض کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے۔ اُن کا شمار اوّل درجے کے چوروں اور ڈاکوؤں میں ہوتا تھا۔ ایک رات وہ اپنا خنجر لئے بُرے ارادے سے ایک گھر کی جانب روانہ

ہوئے۔ گھر کی دیوار پھاند کر اسکے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اسی اثنا میں اُنہیں اس گھر کے پڑوس سے تلاوتِ قرآن کی دل نشین آواز سنائی دی۔ تلاوت کرنے والا اس وقت اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (کیا صاحبانِ ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اُن کے دل ذکرِ خدا اور اُسکی طرف سے نازل ہونے والے حق کے لئے نرم ہو جائیں۔ سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۱۶)

فضیل پر یہ آیت اس قدر اثر انداز ہوئی کہ اُن میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا' اُن کی روح میں ایک ہلچل مچ گئی' یہاں تک کہ وہ یکسر بدل گئے۔ اسی لمحے اُنہوں نے خلوصِ دل کے ساتھ توبہ کی اور ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کر کے روتے ہوئے عرض کیا: یٰارَبِّ قَدْ آنَ (پروردگار! ہاں' تیرے سامنے خضوع و تسلیم کا وقت آن پہنچا ہے)

وہ اسی وقت اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے راستے میں ایک قافلے کے بعض افراد کو دیکھا جو آپس میں کہہ رہے تھے کہ: ہمیں جلد از جلد صبح ہونے سے پہلے اس جگہ سے گزر جانا چاہئے تاکہ فضیل کے راہزن ہمیں لوٹ نہ سکیں۔ فضیل نے ان لوگوں سے اپنا تعارف کرایا اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ اب امان میں ہیں۔

جی ہاں' فضیل نے قرآن کا ایسا احترام کیا!! قرآن کی صدا کو گوشِ جاں سے سنا اور اسے اپنے دل میں اتار کر پارسا' پرہیزگار اور خدا کے ممتاز بندوں میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مکہ آئے اور خانۂ خدا کے جوار میں سکونت اختیار کر لی' اور اس جگہ سے سیر و سلوک اور لوگوں کی تربیت کا کام جاری رکھا' یہاں تک کہ ۱۸۷ ہجری میں عاشور کے دن دنیا سے رخصت ہوئے۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۲۔ ص ۳۶۹' وفیات الاعیان۔ ج ۲۔ ص ۳۱۵)

یہ تھے عبادالرحمٰن کے چند نمونے جنہوں نے حقیقی معنوں میں قرآن کو پہچانا اور اسکے احکام پر عمل کیا اور اپنے قلب اور روح کو آیاتِ قرآنی سے جلا بخشی۔ ان لوگوں کے برعکس دل کے ایسے اندھے بھی ہیں جو آیاتِ قرآنی کو پڑھتے ہیں لیکن ان سے نور کی بجائے اپنے قلب کی سیاہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے نہروان کے خوارج۔

ایک مرتبہ کمیل ابن زیاد' آدھی رات کے وقت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہمراہ کوفہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ اچانک انہوں نے ایک آواز سنی جو قرآنِ کریم کی (سورۂ زمر کی آیت ۹ کی) تلاوت کر رہی تھی۔ کمیل جو تلاوت کرنے والے اس شخص سے واقف نہ تھے' اُس کی پرحزیں آواز کے اثر میں آ گئے اور بے ساختہ ان کے لبوں سے نکلا کہ اے کاش! میں اس شخص کے بدن کا ایک بال ہوتا اور ہمیشہ اس سے قرآن کی تلاوت سنا کرتا۔ حضرت علی نے کمیل کی یہ بات نہیں سنی تھی لیکن آپ یہ جان گئے تھے کہ وہ اس آواز کے فریب میں آ گئے ہیں۔ لہٰذا آپ نے اُن سے فرمایا: قرآن کے اس قاری کی پر درد آواز پر حیرت زدہ نہ ہو' تعجب نہ کرو' کیونکہ یہ شخص اہلِ جہنم میں سے ہے۔ کچھ عرصے بعد میں اپنی اس بات کا سبب تمہیں بتاؤں گا۔

تھوڑے عرصے بعد جنگِ نہروان واقع ہوئی۔ وہی قاری جس کی قرأت نے کمیل کو متاثر کر دیا تھا حضرت علی کے خلاف میدان میں اترا' اور اس جنگ میں مارا گیا۔ کمیل حضرت علی کی رکاب میں لڑ رہے تھے۔ امام کمیل کو اس خارجی کے لاشے کے پاس لائے' اپنی تلوار کی نوک اس کے سر پر رکھی اور فرمایا: اے کمیل! جو شخص اس دن اس قدر سوز و گداز کے ساتھ آیاتِ قرآن پڑھ رہا تھا' وہ یہی شخص تھا۔

کمیل کو ایک جھٹکا سا لگا' اُنہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بے قرار ہو کر اپنے آپ کو حضرت علی کے قدموں پر گرا لیا اور انہیں چومنے لگے اور خدا سے مغفرت طلب کی۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۲۔ ص ۴۹۷)

ایسے افراد (خوارج) وہ اندھے اور بہرے ہیں جو بند آنکھوں اور کانوں کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ جبکہ اُن کے برعکس عبادالرحمٰن آگہی' شعور اور اپنے دل کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعے انوارِ قرآن سے اپنے دل کو منور کرتے ہیں۔

آیئے حقیقتاً قرآن سے آشنائی حاصل کریں' تاکہ اسے دنیا میں اپنا معلم اور آخرت میں اپنا شفیع قرار دیں اور اس عمل کے ذریعے عبادالرحمٰن (خدا کے ممتاز بندوں) کی صف میں کھڑے ہوں۔ تاکہ جن لوگوں کے خلاف روزِ قیامت رسول اللہ شکایت کریں گے' ان میں ہمارا شمار نہ ہو۔

آپ روزِ قیامت عرض کریں گے کہ: یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (اے پروردگار! میری قوم اس قرآن کو چھوڑ بیٹھی تھی۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۳۰)

گفتگو کے آخری حصے کو اس بارے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ایک دل نشیں کلام سے زینت بخشتے ہیں' جس میں آپ نے فرمایا: تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے' جس کی شفاعت مقبول ہے اور ایسا کلام کرنے والا ہے (جس کی ہر بات) تصدیق شدہ ہے۔ قیامت کے دن جس کی یہ شفاعت کرے گا وہ اسکے حق میں مانی جائے گی اور اس روز جس کے عیب بتائے گا اس کے بارے میں بھی اسکے قول کی تصدیق کی جائے گی۔ قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا کہ دیکھو! قرآن کی کھیتی بونے والوں کے علاوہ ہر کاشتکار اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں مبتلا ہے۔ فکونوا من حرثتہ واتباعہ' واستدلوہ علیٰ ربکم واستنصحوہ علیٰ انفسکم' واتھموا علیہ آرائکم' واستغشوا فیہ اھوائکم۔ (لہٰذا تم قرآن کی کھیتی بونے والے اور اسکے پیروکار بنو' اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے اسے دلیل راہ بناؤ اور اپنے نفسوں کے لئے اس سے پند ونصیحت چاہو اور (جب کبھی تمہاری رائے قرآن کے خلاف ہو تو) خود کو الزام دو اور اسکے مقابلے میں اپنی خواہشوں کو غلط اور فریب خوردہ سمجھو۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۷۴)

دعا اور اُس کے مضامین پر توجہ

قرآنِ کریم' خدا کے خاص اور ممتاز بندوں کی بارہویں خصوصیت کے بارے میں فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (اور وہ لوگ برابر دعا کرتے رہتے ہیں کہ خدایا ہمیں' ہماری ازواج اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں صاحبانِ تقویٰ کا پیشوا بنا دے۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۷۴)

خدائے رحمان کے خاص بندوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعا میں خداوند عالم سے عرض کرتے ہیں کہ: بار الٰہا! ہمارے بیوی بچوں کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہمیں متقین کا پیشوا قرار دے۔

یہ خصوصیت اس بات کا اظہار ہے کہ خدا کے یہ ممتاز بندے دعا و مناجات سے خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی خاص توجہ دیتے ہیں کہ دعا کے ذریعے کیا طلب کرنا چاہئے۔ خدا سے ایسی چیزوں کا سوال کرتے ہیں جو انتہائی اہم اور موثر ہوتی ہیں۔ جیسے نیک بیوی کی خواہش' نیک اولاد کی خواہش اور اس سے بھی بڑھ کر خدا سے دعا کرتے ہیں کہ انہیں ایسے مقام پر پہنچا دے کہ معاشرے کے پیشوا اور اسکے لئے ماڈل بن جائیں۔

لہٰذا ہمیں یہاں دو موضوعات پر گفتگو کی ضرورت ہے:

۱۔ دعا کی اہمیت۔

۲۔ دعا کیا ہونی چاہئے۔

اسلام میں دعا کی اہمیت

قرآنِ کریم کی متعدد آیات سے دعا کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ان آیات میں دعا کو اہم ترین عبادت شمار کیا گیا ہے اور اس سے بے توجہی کو استکبار (گھمنڈ) اور عذابِ جہنم کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ (اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔ سورۂ غافر ۴۰۔ آیت ۶۰)

نیز خداوند عالم کا ارشاد ہے: قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ (آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو پروردگار تمہاری پروا بھی نہ کرتا۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۷۷)

قرآنِ کریم میں مختلف شکلوں میں ۲۵ مرتبہ دعا کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور سو سے زیادہ مرتبہ انبیاء وغیرہ کی دعاؤں کا تذکرہ کیا ہے جو رب اور ربنا جیسے کلمات سے شروع ہوتی ہیں۔ اور یہ چیز قرآنِ کریم کی نظر میں دعا کی امتیازی اہمیت کی علامت ہے۔

انبیا اور معصومین کے کلمات میں بھی بہت کم چیزوں پر اتنی توجہ دی گئی ہے جتنی توجہ دعا کے موضوع پر دی گئی ہے۔ یہ ہستیاں ہمیشہ مختلف اوقات میں دعاؤں، مناجات اور خدا سے راز و نیاز میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ اس حوالے سے چند مثالوں کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ وَعَمُوْدُ الدِّیْنِ وَنُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (دعا مومن کا اسلحہ، دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۶۸)

آنحضرت ہی کا ارشاد ہے: اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ وَلَا یَهْلِكُ مَعَ الدُّعَاءِ اَحَدٌ (دعا عبادت کا مغز ہے۔ کوئی دعا کرنے والا ہلاکت کا شکار نہیں ہوتا۔ بحار الانوار۔ ج ۹۳۔ ص ۳۰۰)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے نقل کیا ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: اَحَبُّ

الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فِی الْاَرْضِ الدُّعَاءُ (اللہ رب العزت کی نگاہ میں زمین پر سب سے پسندیدہ عمل دعا ہے) اسکے بعد آپ نے فرمایا: وَكَانَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ رَجُلًا دَعَّاءً (اور امیر المومنین بہت زیادہ دعا کرنے والے شخص تھے۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۶۷، ۴۶۸)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے: اَلدُّعَاءُ مَفَاتِیْحُ النَّجَاحِ وَمَقَالِیْدُ الْفَلَاحِ (دعا کامیابی کی کنجیاں اور فلاح کے خزانے ہیں) اَلدُّعَاءُ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ (دعا مومن کی سپر ہے۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۶۸) اَعْجَزُ النَّاسِ مَنْ عَجَزَ عَنِ الدُّعَا (جو شخص دعا کرنے سے عاجز ہو وہ عاجز ترین انسان ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۹)

دعا کی روشنی میں تین اہم سبق

دعا و مناجات مثبت و تعمیری اثرات (بالخصوص قلب کی پاکیزگی اور تہذیبِ نفس) کی حامل ہوتی ہے اور اس سے بکثرت سبق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ان اسباق میں دعا کے تین اہم درس، بالفاظِ دیگر دعا کے تین پہلو بھی شامل ہیں۔ دعا کے فیوضات حاصل کرنے کے لئے ان اسباق اور ان پہلوؤں کی جانب متوجہ رہنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ دعا، بلاؤں کے دور ہونے اور حاجتوں کے پورا ہونے کے سلسلے میں موثر کردار کی حامل ہے۔ اسی بنیاد پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے: اِدْفَعُوْا اَمْوَاجَ الْبَلَاءِ عَنْكُمْ بِالدُّعَاءِ قَبْلَ وُرُوْدِ الْبَلَاءِ (بلاؤں کی امواج کو ان کے آنے سے پہلے دعا کے ذریعے اپنے سے دور کرو۔ بحار الانوار۔ ج ۹۳۔ ص ۲۸۹)

۲۔ دعا کرتے ہوئے بندہ خدا کی بارگاہ میں گڑگڑاتا، سر جھکاتا اور اس کے ساتھ راز و نیاز کرتا ہے اور یہ کیفیات انسان کے غرور کو توڑتی ہیں اور دل کو معنوی امور کی قبولیت کے لئے آمادہ کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان اطمینانِ نفس، قوتِ قلب اور بلند جذبات و احساسات کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں قرآنِ مجید فرماتا ہے کہ: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً (تم اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خاموشی کے ساتھ پکارو۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۵۵)

۳۔ دعا کے مشمولات و مضمون اور دعا میں موجود بلند پایہ معارف پر توجہ۔ مثال کے طور پر صحیفۂ

سجادیہ کی پہلی دعا اور نہج البلاغہ کا پہلا خطبہ بلند پایہ معارف اور علمی نکات کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ ان معارف پر توجہ' انسان کی معلومات کی سطح اور معرفت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اسلام کی عالی تعلیمات و مفاہیم سے بہتر آشنائی کا ذریعہ ہیں۔ ان اعلیٰ مفاہیم اور تعلیمات میں سر فہرست توحید و خداشناسی ہے' جو استجابتِ دعا کے سلسلے میں اہم کردار کی حامل ہے۔ جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ ایک گروہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: ہم دعا کرتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتی' ایسا کیوں ہوتا ہے؟ امام نے انہیں جواب دیا: **لانکم تدعُونَ مَنْ لا تعرِفُونَه** (اسلئے کہ تم اسے پکارتے ہو' جسے پہچانتے نہیں۔ بحارالانوار۔ ج ۹۳۔ ص ۳۶۸) (یعنی بغیر معرفت الٰہی کے دعا کرتے ہو۔ مترجم)

مجموعی طور پر دعا ایک ایسی عبادت ہے جسے روح کی پاکیزگی اور اسکی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ کردار کا حامل ہونا چاہئے۔ اس کردار کے حصول کے لئے واجب' مستحب اور کمال دعا کی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

دعا کی قبولیت بعض شرائط سے وابستہ ہے اور ان شرائط کے حصول کا تہذیبِ نفس اور تکاملِ انسان سے قریبی تعلق ہے' اور کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر انسان میں دعا کا مثبت اثر ظاہر ہوگا اسی قدر دعا درجۂ قبولیت پائے گی۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے آپ کی توجہ درج ذیل فرامینِ معصومین کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا شخص' جو چاہتا ہے کہ اسکی دعا قبول ہو' اسے چاہئے کہ اپنی خوراک اور ذریعۂ آمدنی کو پاک کرے۔

نیز آپ ہی نے فرمایا ہے: تمہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہئے' وگرنہ خداوند عالم تمہارے نیک لوگوں پر برے لوگوں کو مسلط کر دے گا اور تم کتنی ہی دعا مانگو' لیکن وہ قبول نہیں ہوگی۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۴۴۸' ۴۴۹)

دعائے کمیل میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: **اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیَ الذُّنُوبَ الَّتی تَحْبِسُ الدُّعاء** (بارالٰہا! میرے اُن گناہوں کو بخش دے جو دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بنتے ہیں)

ایک شخص نے امیرالمومنین سے سوال کیا: ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ امام نے اسے جواب دیا: تم نے خدا کو پہچانا ہے' لیکن اس کا حق ادا نہیں کیا۔ رسول پر ایمان لائے ہو' لیکن اُن کے فرامین و احکام کی پیروی نہیں کی۔ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی ہے' لیکن ان کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا۔ زبان سے کہا ہے کہ آتشِ جہنم سے ڈرتے ہو' لیکن تمہارا کردار آتشِ جہنم میں داخلے کا موجب ہوتا ہے۔ زبان سے کہتے ہو کہ تمہیں جنت پسند ہے' لیکن اپنے عمل سے جنت سے دور ہو گئے ہو۔ خدا کی نعمتوں سے استفادہ کیا ہے' لیکن ان کا شکر ادا نہیں کیا۔ خدا فرماتا ہے کہ شیطان سے دشمنی رکھو' تم نے اپنی زبان سے تو اس سے دشمنی کا اظہار کیا ہے' لیکن عمل سے اس سے دوستی کی ہے۔ تم نے دوسرے لوگوں کے عیب تو دیکھے ہیں' لیکن اپنے عیبوں کو نظر انداز کیا ہے۔ اگر تمہاری نیت خالص ہو اور تم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرو' تو تمہاری دعائیں قبول ہوں گی۔ (سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۴۴۹)

ایسی بکثرت روایات موجود ہیں' جن میں دعا کی قبولیت کے لئے اس کی شرائط فراہم کرنے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمیں بے سوچے سمجھے اور صرف بظاہر دعا کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ دعا کے مضمون و مشمولات اور شرائط پر بھی توجہ دینی چاہئے' تاکہ اس عمل سے بھرپور اور مکمل استفادہ کیا جا سکے۔

دعا کے مضمون پر توجہ اور بے موقع یا کم فائدہ دعاؤں سے اجتناب

زیر بحث آیت (سورۂ فرقان کی آیت ۷۴) میں واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے ممتاز اور خاص بندے وہ لوگ ہیں جو دعا کرتے ہیں اور دعا کے ذریعے خدا کے سامنے اپنی ان تین خواہشات کا اظہار کرتے ہیں: ۱: اچھی بیوی۔ ۲: صالح اولاد۔ ۳: لوگوں کے پیشوا' رہنما اور ان کے لئے نمونۂ عمل کا مقام۔

یعنی یہ لوگ اس بات سے باخبر ہیں کہ انہیں دعا کے ذریعے اپنے رب سے کیا مانگنا چاہئے' لہٰذا خدا سے اہم چیزیں طلب کرتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ بارالٰہا! ہماری بیوی اور بچوں کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے۔

آنکھوں کی ٹھنڈک یا نورِ چشم کی اصطلاح کمال وسعادت کا رمز ہے۔ کیونکہ اچھی بیوی اور صالح اولاد انسان کے اطمینان اور اسکی سعادت کا موجب ہوتے ہیں اور انسان کی روح کو فرحت بخشتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اسے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کا نور حاصل ہوتا ہے۔ واضح الفاظ میں عرض ہے کہ صالح اولاد اور اچھی بیوی' انسان کی زندگی کو نورانیت اور پاکیزگی دیتے ہیں اور دنیا و آخرت میں اس کی عزت و آبرو' سرخروئی اور سربلندی کا باعث بنتے ہیں۔ اس قسم کی دعائیں سودمند اور مفید آثار کی حامل ہیں' برخلاف اُن بیہودہ اور کم فائدہ دعاؤں کے جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

انسان کو تمام ہی امور میں' حتیٰ اپنی دعاؤں میں بھی بلند عزائم اور بلند تمناؤں کا مالک ہونا چاہئے اور دعا کی نورانیت کے سائے میں بلند مقامات تک رسائی حاصل کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ اس کی دعا ہو کہ وہ لوگوں کا پیشوا' رہبر اور ان کے لئے نمونۂ عمل بنے۔

دعاؤں کو صرف مادّی امور تک محدود نہیں رکھنا چاہئے' نہ ہی بارگاہِ الٰہی میں حقیر چیزوں کی درخواست کرنی چاہئے۔ اسی بنا پر امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: چار قسم کے لوگوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ (۱) ایسے شخص کی دعا جو اپنے گھر میں بیٹھا یہ دعا مانگتا ہے کہ بارالٰہا! مجھے روزی عنایت فرما۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ کیا میں نے تجھے کوشش اور جدوجہد کا حکم نہیں دیا تھا؟ (۲) ایسے شخص کی دعا جس کی (بری اور مسلسل تکلیف پہنچانے والی) بیوی ہو' اور وہ اس سے نجات کی دعا کرتا ہو۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ کیا میں نے تجھے طلاق کا حق نہیں دیا تھا۔ (۳) ایسا شخص جس کے پاس کوئی مال ہو اور اسے اس نے بغیر کسی کو گواہ بنائے کسی دوسرے کو قرض دے دیا ہو (اور قرض لینے والا مکر گیا ہو اور قرض دینے والا یہ دعا کرتا ہو کہ خدایا اسکے دل میں نیکی ڈال تاکہ وہ میرا قرض ادا کردے) ایسے شخص سے کہا جاتا ہے کہ کیا میں نے تجھے حکم نہیں دیا تھا کہ قرض دیتے وقت گواہ رکھنا۔ (اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۵۱۱)

جب ہم انبیا' ائمہ اور اولیائے الٰہی کی دعاؤں کا جائزہ لیتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ دعا کے دوران اکثر ان کی خواہشات کا محور بلند پایہ معنوی' اجتماعی اور سیاسی امور ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت

ابراہیم کی دعا یہ تھی کہ: رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ (پروردگارا! مجھے اور میری ذریت میں نماز قائم کرنے والے قرار دے اور پروردگار میری دعا کو قبول کرلے۔ سورۂ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۴۰)

ائمہ معصومین جو راسخون فی العلم ہیں' یوں دعا کیا کرتے تھے: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (پروردگارا! جب تو نے ہمیں ہدایت دے دی ہے' تو اب ہمارے دلوں میں کجی (گمراہی) پیدا نہ ہونے پائے' اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما' کہ تو بہترین عطا کرنے والا ہے۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۸)

اصحاب کہف کی دعا یہ تھی کہ: رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (پروردگارا! ہم کو اپنی طرف سے رحمت عطا فرما اور ہمارے لئے ہدایت اور نجات کی راہ فراہم فرما۔ سورۂ کہف ۱۸۔ آیت ۱۰)

صحیفۂ سجادیہ اور مفاتیح الجنان میں نقل ہونے والی ائمہ کی دعاؤں پر توجہ ہمیں دعا کرنے کے انداز سے آشنا کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ہم کس طرح اپنے رب سے دعا مانگیں۔

مثلاً امام حسین علیہ السلام اپنی دعائے عرفہ کے ایک حصے میں خدا سے یوں عرض کرتے ہیں کہ: اللھمّ اجعلنی اَخشاکَ کانّی اراک' واَسْعِدْنی بِتقواکَ' ولاَ تُشْقِنی مِنْ مَعْصِیَتِکَ (بارالٰہا! مجھے اپنی درگاہ میں ایسے خوف وخشیت کے ساتھ کھڑا کردے' گویا میں تجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اور تقویٰ کے سائے میں مجھے سعادت مند فرما' اور گناہ کی بنا پر سیاہ بخت نہ بنا دینا۔ مفاتیح الجنان۔ دعائے عرفہ)

اس نکتے اور مفہوم کی وضاحت کے لئے ایک دلچسپ داستان نقل کرتے ہیں:

بیان کیا گیا ہے کہ خداوندِ عالم نے بنی اسرائیل کے انبیا میں سے ایک نبی پر وحی کی کہ فلاں عابد سے کہیں کہ اس کی تین دعائیں ہماری بارگاہ میں قبول کی جائیں گی۔ نبیؑ نے خدا کی یہ وحی اس عابد تک پہنچا دی۔ اس عابد نے معاملہ اپنی بیوی کے سامنے رکھا(۱) اس کی بیوی نے اس پر زور دیا

۱۔ کتاب سیاستنامہ کے صفحہ ۳۲۳ پر اس شوہر کا نام یوسف اور اس کی بیوی کا نام کرسف بیان ہوا ہے۔

کہ ان تین میں سے ایک دعا میرے لئے طلب کرے۔ عابد نے اس کی یہ تجویز مان لی۔ اس کی بیوی نے اس سے کہا کہ میرے لئے دعا مانگو کہ خدا مجھے اپنے زمانے کی حسین ترین عورتوں میں سے بنادے۔ عابد نے یہ دعا مانگی اور اس کی بیوی دنیا کی خوبصورت ترین عورتوں میں سے ہوگئی۔

اس کی خوبصورتی کا چرچا ہوا تو بادشاہِ وقت اور خواہشاتِ نفسانی کے غلام امیر زادے اس کی زلف کے اسیر ہوگئے اور اسے پیغام بھیجنے لگے کہ اپنے مفلوک الحال بوڑھے اور زاہد شوہر کو چھوڑ کر ہمارے پاس آجاؤ تا کہ دنیا کی ہر لذت سے لطف اندوز ہوسکو۔ وہ عورت ان کے فریب میں آگئی اور اپنے شوہر سے بدسلوکی کرنے لگی۔ اس طرح ان میاں بیوی کے باہمی تعلقات خراب ہو گئے۔ آخر کار اس عابد شخص نے اپنی بیوی سے ناراض ہو کر اپنی دوسری دعا مانگی اور وہ یہ تھی کہ:
بارالہا! میری بیوی کو کتا بنادے۔

عابد کی دعا پوری ہوئی اور وہ عورت کتا بن گئی۔

اس عورت کے بھائی اور دوسرے رشتے دار عابد کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ لوگوں میں ہماری رسوائی ہو رہی ہے، ہم آپ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ اپنی تیسری دعا طلب کیجئے تا کہ آپ کی بیوی اپنی پہلی والی صورت میں واپس آجائے۔ ان لوگوں کے شدید اصرار پر عابد نے اپنی تیسری دعا بھی طلب کی اور عرض کیا کہ: بارالہا! میری بیوی کو اس کی پہلی حالت پر واپس پلٹادے۔
عابد کی دعا قبول ہوئی اور اس کی بیوی اپنی پہلی صورت پر واپس آگئی۔

اس طرح اس عابد کی تینوں مقبول دعائیں رائگاں گئیں۔ (بحار الانوار۔ ج ۱۴۔ ص ۴۸۵)

اگر وہ عابد سمجھ بوجھ رکھنے والا ہوتا تو اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا تھا اور اپنی دنیا اور آخرت کی کامیابی و سعادت حاصل کرسکتا تھا۔

دعا میں تین خوبصورت خواہشیں

ایک مرتبہ پھر زیر بحث آیت کی تفسیر کی جانب آتے ہیں۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا کے ممتاز بندے اپنی دعا میں خدا سے عرض کرتے ہیں کہ: ہمیں اچھی بیوی اور صالح اولاد

عنایت فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا اور قائد بنا۔

یہ تین تمنائیں ایک کامیاب اور سعادت مند زندگی کی بہترین خواہشات ہیں۔ ان تین تمناؤں کی اہمیت جاننے کے لئے ان کی مختصر وضاحت کرتے ہیں۔

اچھی بیوی اور اسکے اثرات

اچھی بیوی اپنے شوہر کے لئے بہترین معاون و مددگار ہوتی ہے۔ زندگی کی خوبصورتی و دوام اور اسکی کامیابی و شادابی کا موجب ہوتی ہے اور گھرانے کی عمدہ نگہداشت اور اسکی تعمیر میں انتہائی موثر کردار ادا کرتی ہے۔ لہٰذا ان خصوصیات کی حامل بیوی کے چناؤ اور اسکی تربیت کے لئے گہری توجہ ضروری ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی شریک حیات کے انتخاب کے سلسلے میں رسول مقبول سے مشورہ کیا۔ آنحضرت نے اس سے فرمایا: انکِحْ وعلیکَ بذاتِ الدِّینَ (شادی کرو لیکن تمہیں چاہئے کہ دیندار عورت سے شادی کرو۔ فروع کافی۔ ج ۵۔ ص ۳۳۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابراہیم کرخی سے فرمایا: ایسی لڑکی سے شادی کرو جس کا گھرانہ اصیل اور نیک ہو، جو اچھے اخلاق کی حامل ہو، جس میں صاحب اولاد ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہو، جو دنیا اور آخرت کے امور میں اپنے شوہر کی مددگار ہو۔ (فروع کافی۔ ج ۵۔ ص ۳۲۳)

اس بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: میری امت کی بہترین عورتیں وہ ہیں جن کا مہر کم ہو اور جو خوبرو ہوں۔ (فروع کافی۔ ج ۵۔ ص ۳۲۴)

اس حوالے سے جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ درج ذیل بارہ خصوصیات اچھی بیوی کی علامات ہیں۔ (۱) دینداری۔ (۲) اچھا اخلاق۔ (۳) خوبصورتی۔ (۴) مہر کا کم ہونا۔ (۵) بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت۔ (۶) محبت کرنے والی۔ (۷) پاکدامن۔ (۸) شوہر کی اطاعت گزار اور اس کے لئے سنورنے والی۔ (۹) اچھے اور اصیل گھرانے سے تعلق رکھنے والی۔ (۱۰) سچی اور امانتدار۔ (۱۱) صاف ستھری اور معطر رہنے والی۔ (۱۲) سمجھ بوجھ کی حامل اور خوش اسلوبی کے ساتھ امور زندگی کی تنظیم کرنے والی۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ایاکم و تزویج الحمقاء، فانّ صُحبتہا بلاءٌ وولدہا ضیاعٌ (کم عقل عورتوں کے ساتھ شادی سے پرہیز کرو' کیونکہ ان کی ہم نشینی بلا ہے اور ان کے بچے برباد ہیں۔ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۴۔ ص ۵۶)

متعدد روایات میں کہا گیا ہے کہ شادی کرتے وقت تمہارے پیشِ نظر مال و دولت کا حصول اور شریکِ حیات کی خوبصورتی نہیں ہونا چاہئے' بلکہ اپنے شریکِ حیات کے ایمان اور اسکی پاکدامنی کو پیشِ نظر رکھو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جب کبھی کوئی شخص کسی خاتون سے اسکے مال و دولت کی خاطر شادی کرتا ہے' تو خدا اسے اسی مال و دولت کے حوالے کر دیتا ہے (اور دوسرے فوائد سے محروم رکھتا ہے) اور جو کوئی کسی عورت سے اسکے حسن و جمال کے لئے شادی کرتا ہے' تو اس سے ناگوار امور سامنے آتے ہیں۔ اور جو کوئی کسی خاتون سے اسکے دین کی خاطر شادی کرتا ہے' تو خدا اسے محروم نہیں رکھتا۔ (وسائل الشیعہ۔ ج ۱۴۔ ص ۳۱)

لہٰذا اچھی بیوی کا شمار زندگی کے اہم ترین عناصر میں ہوتا ہے۔ خداوند عالم کا ممتاز بندہ اپنی دعا میں بھی اور اپنے انتخاب میں بھی اس موضوع کو اچھی طرح پیشِ نظر رکھتا ہے' تاکہ اس کے ذریعے اپنی سعادت اور کامرانی کا ایک اہم عامل فراہم کرسکے۔

صالح اولاد

جو عناصر کسی انسان کی سعادت و کامرانی میں شمار کئے جاتے ہیں اُن میں سے ایک اہم ترین عنصر اسکا صالح اولاد کا مالک ہونا ہے' جو واقعاً ایک بیش بہا الٰہی نعمت ہوتی ہے۔

اسکے برخلاف غیر صالح اولاد بڑی اور وہ تباہ کن بلا ہے' جو دنیا اور آخرت دونوں کی ناکامی اور مصیبت کا باعث ہے۔ انبیا اور اولیائے الٰہی' اپنی دعاؤں اور مناجات میں بھی اور اپنے عمل کے ذریعے بھی صالح اولاد کے حصول کے طالب ہوتے ہیں اور اپنے بچے کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے سلسلے میں کسی تعمیری عامل کو نظر انداز نہیں کرتے۔

اس بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک شیعہ سے فرمایا: جب تم شادی کا

ارادہ کرو' تو دو رکعت نماز پڑھو اور حمد و سپاسِ الٰہی کے بعد دعا کرو اور دعا میں کہو کہ:۔۔۔ اور میرے لئے اس بیوی سے ایسا طیب اور پاک فرزند نصیب فرما جو میری زندگی میں اور میری موت کے بعد میرا صالح جانشین ثابت ہو۔ (وسائل الشیعہ۔ ج ۱۴۔ ص ۷۹)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی ایک گفتگو میں فرمایا: خدا کی قسم! میں نے بارگاہِ الٰہی میں خوبصورت اور خوش اندام اولاد کی درخواست نہیں کی تھی۔ بلکہ پروردگار سے التماس کی تھی کہ مجھے اللہ کی مطیع و فرمانبردار اور خوفِ خدا رکھنے والی اولاد عنایت فرما۔ اور جب کبھی میں اسے دیکھوں' اور اسے خدا کا اطاعت گزار پاؤں' تو یہ دیکھ کر میری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔ (مناقب ابن شہر آشوب۔ ج ۳۔ ص ۳۸۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انّ الولد الصالح ریحانۃٌ مِن ریاحینِ الجنّۃِ (بے شک صالح اولاد جنت کے خوشبودار پھولوں میں سے ایک پھول ہے۔ فروعِ کافی۔ ج ۶۔ ص ۳)

بحار الانوار کے مولف علامہ محمد باقر مجلسی علیہ الرحمہ کے والدِ گرامی' عالمِ بزرگوار مرحوم ملاّ محمد تقی مجلسی کے حالاتِ زندگی میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک رات نمازِ شب کے بعد مجھ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اگر میں اس موقع پر خدا سے کوئی دعا مانگوں تو وہ دعا قبول ہوگی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا درخواست کروں کہ اچانک میرے بیٹے محمد باقر کی آواز بلند ہوئی' جو اس وقت اپنے جھولے میں تھا۔ میں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ: بار الٰہا! بحق محمد و آلِ محمد! اس بچے کو مروجِ دین اور سید الانبیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو فروغ دینے والا قرار دے۔ اور اسے بھرپور توفیقات عنایت فرما۔ (مستدرک الوسائل۔ ج ۳۔ ص ۴۰۸)

یہی دعا اس بات کا باعث ہوئی کہ خداوند عالم نے ملاّ باقر مجلسی کو توفیق کے تمام اسباب فراہم کئے۔ یہاں تک کہ جب وہ بڑے ہوئے تو ان کا کمال روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا اور انہوں نے اپنے بیان اور قلم کے ذریعے اسلام اور دینی احکام کی نشر و اشاعت کی بھرپور توفیقات حاصل

کیں اور بکثرت گرانقدر آثار اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے، جن میں سے ایک اثر، ایک سو دس جلدوں پر مشتمل بحارالانوار ہے۔

معروف محدث حاجی نوری علیہ الرحمہ کے بقول، علامہ مجلسی کا مقام اور ترویج اسلام میں ان کی توفیق اس درجے پر پہنچی کہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی کتاب تحفہ میں لکھا ہے کہ: اگر مذہب شیعہ کا نام مذہب مجلسی رکھا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ اس مذہب کو رونق اور فروغ علامہ مجلسی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ (مستدرک الوسائل۔ ج ۳۔ ص ۴۰۸)

نتیجہ یہ کہ بڑے لوگ صالح اولاد کے مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اسے اپنی زندگی کے سرفہرست مسئلے کے طور پر توجہ کا مرکز قرار دیتے تھے۔

لوگوں کا پیشوا اور قائد ہونا

بے شک مقامِ امامت اعلیٰ ترین مقام ہے، جسے اسلام نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ زیر بحث آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ عبادالرحمٰن (یعنی خدا کے ممتاز بندے) وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ تقویٰ اور جہدِ مسلسل کے ذریعے محترم ترین مقام تک رسائی حاصل کریں اور لوگوں کے پیشوا اور قائد بن جائیں۔

واضح ہے کہ اس مقام کا حصول تہذیبِ نفس کے مراحل طے کرنے اور معنوی کمالات کسب کرنے سے وابستہ ہے۔ جیسے کہ حضرت ابراہیم کڑی آزمائشوں اور عالی درجات طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچے اور خداوند عالم نے ان سے فرمایا: ... اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (ہم تم کو لوگوں کا امام اور قائد بنا رہے ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۲۴)

یہ دعا اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا کے ممتاز بندوں کو چاہئے کہ اپنے آپ کو ایسا بنائیں اور ایسے بلند عزائم رکھیں کہ لوگوں کے رہبر اور رہنما بن سکیں اور لوگ ان کے وجود سے پھوٹنے والی روشنی سے استفادہ کریں اور ان کے فیوضات لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر صراط مستقیم اور روشنی کی جانب لے آئیں۔ اور وہ یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ اگر وہ کوشش کریں تو تقویٰ اور عملِ صالح کے سائے میں عالی درجات حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ دعا، تمنا اور خواہش وہی ہے جو تمام انبیاء، ائمہ اور اولیائے الٰہی رکھتے تھے۔ جیسے کہ اسی جیسی بات امام زین العابدین علیہ السلام کی دعائے مکارم الاخلاق میں آئی ہے، جہاں آپ نے خداوند عزوجل سے دعا کرتے ہوئے عرض کیا ہے کہ: وَاجْعَلْنِی مِنْ اَهْلِ السَّدادِ وَمِنْ اَدِلَّةِ الرَّشادِ (اور مجھے درست کاروں اور ہدایت کے رہنماؤں میں سے قرار دے۔ مفاتیح الجنان۔ دعائے مکارم الاخلاق)

عباد الرحمٰن کی عظیم الشان جزا

قرآنِ مجید خدا کے خاص اور ممتاز بندوں کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد روزِ قیامت ان بندوں کی ظاہری اور باطنی جزا اور اجر و ثواب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ یُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّ سَلٰمًا خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا (یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کی بنا پر جنت کے اونچے اونچے محل عطا کئے جائیں گے اور وہاں انہیں تعظیم اور سلام پیش کیے جائیں گے۔ وہ انہی مقامات پر ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے کہ وہ بہترین مستقر اور حسین ترین جائے قیام ہے۔ سورۂ فرقان ۲۵۔ آیات ۷۵ تا ۷۶)

ان آیات میں عباد الرحمٰن کو ملنے والی جزا و پاداش کو بیان کیا گیا ہے، جو انتہائی عظیم الشان اور خصوصی امتیازات کے ہمراہ ہوگی۔ ان آیات کا تقاضا ہے کہ اس گفتگو میں، ان چار موضوعات، یعنی جزا و پاداش، عباد الرحمٰن کی مخصوص جزا، تعمیر کردار میں صبر و استقامت کی اہمیت اور خلود اور ہمیشگی و جاودانی کے موضوع کا جائزہ لیا جائے۔

صبر کی اہمیت پر گفتگو کو ہم آئندہ نشست کے لئے چھوڑتے ہیں۔ یہاں آپ کی توجہ دوسرے تین موضوعات کی جانب مبذول کراتے ہیں۔

جزا و پاداش

جزا و پاداش، بالفاظِ دیگر جزا اور مکافاتِ عمل کا مسئلہ خداوند عالم کے قطعی تکوینی اور تشریعی

قوانین میں سے ہے' جو اچھے یا برے عمل کی مناسبت سے ان اعمال کو انجام دینے والے پر دنیا اور آخرت میں مختلف شکلوں میں اثر انداز ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم میں اس بارے میں بکثرت آیات موجود ہیں' یہ یقینی امور میں سے ہے اور اسکے وقوع پذیر ہونے میں کسی قسم کے شک و تردید کی گنجائش نہیں۔

اگر ہم قرآنِ مجید میں مختلف انداز سے سیکڑوں بار استعمال ہونے والے لفظ "جزا" کا جائزہ لیں' تو بخوبی اس بات کا علم حاصل کریں گے کہ دنیاوی اور اُخروی جزا کا مسئلہ قرآنِ مجید میں بیان ہونے والے مسلمہ امور میں سے ہے اور خداوند عالم نے انتہائی زور دے کر اس کا تذکرہ کیا ہے' تاکہ پیروانِ قرآن اس قطعی قانون کو کسی صورت فراموش نہ کریں اور اس سے غفلت نہ برتیں۔

مثال کے طور پر اگر ہم قرآنِ کریم کی سورۂ نبا کا مطالعہ کریں' تو وہاں دیکھیں گے کہ اس سورے کی آیت ۲۱ سے لے کر ۳۰ تک میں' نہایت واضح الفاظ کے ساتھ اہلِ جہنم کی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور آیت نمبر ۳۱ سے ۳۶ تک میں اہلِ جنت کی جزا و پاداش کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسی سورے کی آیت ۲۶ میں فرمانِ الٰہی ہے: جَزَآءً وِّفَاقًا (یہ اُن کے اعمال کے موافق و مناسب بدلہ ہے)۔ اسی سورے کی آیت ۳۶ میں خدا فرماتا ہے: جَزَآءً مِّنْ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا (یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حساب کی ہوئی عطا ہے اور تمہارے اعمال کی جزا ہے) لہٰذا انسان جو کوئی بھی عمل انجام دیتا ہے' وہ خداوند عالم کے دقیق اور ٹھیک ٹھیک حساب میں ثبت اور درج ہو جاتا ہے اور تمام اچھے برے اعمال کے مقابل مناسب جزا یا سزا مقرر ہے۔

جزا و سزا کا مسئلہ صرف آخرت سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا کچھ حصہ اسی دنیا میں بھی وجود رکھتا ہے اور انسان کے اعمال کی وجہ سے مختلف صورتوں میں انسان کو اسی دنیا میں نصیب ہو جاتا ہے۔(۱)

اس بارے میں روایات بھی بے حساب ہیں' مثال کے طور پر امیر المومنین حضرت علی علیہ

۱۔ سورۂ نجم ۵۳ کی آیت ۳۱' سورۂ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۵ اس بارے میں واضح دلالت کرتی ہیں۔

السلام نے فرمایا ہے: کُلُّ امْرِءٍ یُلْقٰی ماعَمِلَ وَ یُجْزیٰ بِماصَنَعَ (ہر انسان اپنے عمل کا سامنا کرتا ہے' اور جو کچھ وہ انجام دیتا ہے' اسکی بنیاد پر اسے جزا و سزا دی جاتی ہے) نیز آپ ہی نے فرمایا ہے: کَماتَدینُ تُدان (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ غرر الحکم۔ ج ۳۔ ص ۵۷۱)

لِکُلِّ حَسَنَةٍ ثوابٌ (ہر نیکی کا ثواب ہے) لِکُلِّ سَیِّئَةٍ عقاب (ہر بدی کا عقاب ہے۔ غرر الحکم۔ ج ۳۔ ص ۵۷۷)۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: اَماانّه لیسَ مِنْ عِرْقٍ یضربُ' ولا نکبةٍ' ولا صُداعٍ' ولا مرضٍ الاّبذنبٍ (جو بھی رگ (اور کوئی نبض) زخمی ہوتی ہے' پاؤں پتھر سے ٹکراتا ہے' درد سر اور مرض لاحق ہوتا ہے' اسکی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ انسان نے کوئی گناہ کیا ہوتا ہے۔(۱)

عباد الرحمٰن کا خصوصی ثواب

کیونکہ عباد الرحمٰن' خدا کے ممتاز اور خاص بندے' اپنی بارہ خصوصیات کی وجہ سے مومنین کی صفِ اول میں ہوتے ہیں' لہٰذا خداوند عالم ان کی جزا اور ثواب کی مناسبت سے انہیں جنت کے بلند اور عالی ترین درجے میں جگہ دیتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جو اہم ترین امتیازات کا حامل ہے۔

پہلے خداوند عالم فرماتا ہے کہ: غرفہ' بہشت ان کے اختیار میں ہوگا۔ غرفہ کے معنی گھروں کا بلند ترین طبقہ ہے اور یہاں بے مثل اور انتہائی گراں قیمت محل کا کنایہ ہے' جو جنت کے دوسرے حصوں سے انتہائی بلند مقام کا حامل ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ یہ عظیم الشان محل تین انتہائی اہم خصوصیات رکھتا ہے۔

۱۔ عباد رحمٰن کا وہاں ہمیشہ خاص احترام کیا جائے گا' اور وہ خدا' فرشتوں اور اہلِ جنت کے تحیت و سلام سے بہرہ مند ہوں گے۔ ہمیشہ بلند مقامات انہیں سلامتی اور ہر قسم کی ظاہری و باطنی رفاہ و

۱۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۹' اسی کتاب کے صفحہ ۲۶۸ سے ۲۷۶ تک "باب الذنوب" کے عنوان کے تحت تمیں روایتیں نقل کی گئی ہیں' جو مکافاتِ عمل کو بیان کرتی ہیں۔

آسائش کے ساتھ پاک و پاکیزہ زندگی کی بشارت دیں گے۔

۲۔ وہ ایک ایسے ٹھکانے میں ہوں گے جو انتہائی خوبصورت' ہرا بھرا' پاک و پاکیزہ اور ہر قسم کی تکالیف' مشکلات اور غموں سے دور ہوگا۔

۳۔ یہ لوگ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ وہاں فنا' موت اور نابودی کا سوال ہی نہ ہوگا اور انہیں اس عالی شان جگہ سے نکالے جانے کا کوئی دھڑکا اور اندیشہ نہیں ہوگا۔

سچی بات ہے' اس سے بڑی نعمت کیا ہوگی کہ انسان ایک ایسے محل میں رہے جو ہمیشہ ہمیش رہے گا' اور وہ اس محل میں زندگی کی تمام نعمتوں' خوبصورتیوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو اور اسے وہاں فنا اور دوسری غم انگیز باتوں کی طرف سے کوئی تشویش نہ ہو۔

ان جزاؤں میں سب سے بڑی جزا ان پر خدا اور اسکے فرشتوں کا مسلسل تحیت و سلام ہے۔ جس کی لذت و لطف قابلِ بیان اور قابلِ ادراک نہیں۔ امتیازی مقام کے حامل اہلِ جنت پر خدا اور فرشتوں کے سلام کے بارے میں قرآن کی ایک اور آیت میں ذکر ہوا ہے کہ: سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ (ان کے حق میں ان کے مہربان پروردگار کا قول صرف سلامتی ہوگا۔ سورہ یٰسین ۳۶۔ آیت ۵۸) اسی طرح ایک اور مقام پر ہے کہ: وَ الْمَلٰٓئِکَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (اور ملائکہ ہر دروازے سے ان کے پاس حاضری دیں گے۔ کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا ہے اور اب آخرت کا گھر تمہاری بہترین منزل ہے۔۔ سورہ رعد ۱۳۔ آیت ۲۳' ۲۴)

خلود و جاویدانگی کی اہمیت

معاد اور جنت و دوزخ کی گفتگو میں ایک مسئلہ خلود اور جاویدانگی کا مسئلہ ہے۔ یعنی دوزخ کا عذاب ہمیشہ کے لئے اور ناقابلِ زوال ہے۔ اسی طرح جیسے بہشت کی نعمتیں بھی دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔

قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں خلود کے مسئلے پر بات ہوئی ہے' اور اس کی وضاحت اس قدر قطعی ہے کہ اسکی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

خلود کے معنی ایسی بقا اور دوام ہے جس میں زوال اور نابودی کی گنجائش نہ ہو۔ "لسان العرب" نامی عربی لغت میں "خلد" کے معنی ایسے ٹھکانے اور سرائے میں ہمیشہ ہمیش رہنا بیان ہوئے ہیں جس سے انسان کو باہر نہیں نکالا جائے گا۔ مزید کہا گیا ہے کہ اسی بنا پر آخرت کو "دار الخلد" کہتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہی معنی دوسری عربی لغتوں "مقاییس اللغة" اور "صحاح اللغة" میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔

اگرچہ بعض مفسرین نے خلود کے معنی کی توجیہات کی ہیں' مثلاً اسے طولانی وغیرہ کہا ہے اور اسکے بارے میں مختلف احتمالات کا اظہار کیا ہے لیکن قرآنی آیات کی وضاحت و صراحت کے سامنے یہ توجیہات و احتمالات قابلِ قبول نہیں' اور علمائے اسلام اور چوٹی کے مفسرین نے انہیں مسترد کیا ہے۔

خلود کے معنی جاویدانگی ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں اور دوسری تعبیریں بھی موجود ہیں' جو اس قسم کی توجیہات و احتمالات کے قابل نہیں' اور جاویدانگی پر صراحت کی حامل ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر ہے: وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا اسکے لئے جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اسی میں رہنے والا ہے۔ سورۂ جن ۷۲۔ آیت ۲۳) یا ایک اور جگہ پر ہے کہ: وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ (اور ان میں سے کوئی آتشِ دوزخ سے نہیں نکلے گا۔ سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۶۷) ایک اور مقام پر ہے: اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (اور جنت کے پھل دائمی ہوں گے اور سایہ بھی ہمیشہ رہے گا۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۳۵)

اہلِ دوزخ کے خلود کے بارے میں ایک اہم اعتراض اٹھایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ دائمی عذاب عدالت کے برخلاف ہو سکتا ہے اور چند سال کے گناہوں سے کوئی تناسب نہیں رکھتا۔ اپنے مقام پر اس اعتراض کا جواب دیا جا چکا ہے۔ (۱)

۱۔ اس بارے میں تفسیر موضوعی قرآن "پیامِ قرآن" کی۔ ج ۶۔ ص ۵۰۰' ۵۰۱ کا مطالعہ فرمائیے۔

لیکن بہشت اور ہمیشہ جاری خدا کی نعمتوں کے بارے میں خداوند عالم کے بے پایاں فضل وکرم کی بنا پر کسی قسم کا اعتراض واشکال نہیں اٹھایا جاسکتا' وہ خدا جس کی رحمت پورے عالم پر چھائی ہوئی ہے بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے' اس کا زیادہ اجر وثواب عطا کرنا اور بے پایاں لطف وکرم کا برتاؤ کرنا کسی صورت باعث تعجب نہیں۔

لہٰذا اپنے ممتاز اور پیارے بندوں پر خدا کے مسلسل اور دائمی فضل وکرم کے حوالے سے کوئی عقلی رکاوٹ حائل نہیں' یہ شرع کے لحاظ سے ثابت ہے' اور آیات قرآنی (جن میں زیر بحث آیت بھی شامل ہے) کی رو سے مسلمات میں سے ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض آیات قرآنی میں دنیا اور آخرت کی جزا و پاداش کے مابین فرق رکھا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ: فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ (تو خدا نے انہیں دنیا میں بدلہ بھی دیا اور آخرت کا بہترین ثواب بھی عطا کیا۔ سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۴۸)

جزا وثواب اچھی چیز ہے' خواہ وہ دنیا کی ہو خواہ آخرت کی لیکن اسکے باوجود مذکورہ آیت میں صرف آخرت کی جزا کو نیک اور حسن بتایا گیا ہے' اور یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی جزا میں فرق ہے۔ کیونکہ دنیا کی جزا جو کچھ بھی اور کتنی ہی کیوں نہ ہو' آخر کار اُسے فنا اور زوال کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ نیز دوسری مشکلات جو دنیا کی زندگی کی خاصیت ہیں' اسکے ہمراہ ہوں گی' جبکہ آخرت کی جزا' اور وہاں ملنے والا بدلا' دائمی' ہمیشہ رہنے والا اور مشکلات سے خالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلمات میں بارہا اس نکتے کا ذکر کیا ہے۔ ایک خطبے میں فرمایا ہے: فاما اهلُ الطاعةِ فاثابهم بجوارهِ' وخلّدهم فی دارهِ' حیثُ لا یظعنُ النزالُ' ولا تتغیّرُ بهمُ الحالُ' ولا تنوبُهم الافزاعُ' ولا تنالُهم الاسقامُ' ولا تعرِضُ لهم الاخطارُ' ولا تشخصهم الاسفار (جو فرمانبردار تھے انہیں جزا دے گا کہ وہ اسکے جوارِ رحمت میں رہیں اور اپنے گھر میں انہیں ہمیشہ کے لئے ٹھہرا دے گا کہ جہاں اترنے والے پھر کوچ نہیں کیا کرتے اور نہ ان کے حالات ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور نہ انہیں

گھڑی گھڑی خوف ستاتا ہے' نہ بیماریاں ان پر آتی ہیں' نہ انہیں خطرات درپیش ہوتے ہیں اور نہ انہیں سفر ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتے ہیں۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۷)

وضاحت کے طور پر عرض ہے کہ خلود اور جاویدانگی کا مسئلہ کوئی سادہ مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے' جو انسانوں کی لئے ایک عظیم اشتباہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم کسی جگہ ایک کا عدد تحریر کریں اور اسکے پہلو میں بے انتہا دور تک صفر لگاتے چلے جائیں اور ان اَن گنت اعداد کے ذریعے خلود کی انتہا معلوم کرنا چاہیں' تب بھی معلوم نہ کرسکیں گے۔

لہٰذا وہ مجرمین جن سے خدا نے دائمی آتش جہنم کا وعدہ کیا ہے انہیں خیال رکھنا چاہئے کہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں رہنا ہے۔ اور ان کے مقابل ممتاز پاکیزہ بندگان خدا' جیسے "عباد الرحمٰن" جنہیں خدا عظیم دائمی جزا سے نوازے گا' انہیں یہ بات ذہن سے نہیں نکالنی چاہئے کہ انہیں ایسی دائمی جزا سے نوازا جائے گا جو کبھی ختم نہ ہوگی۔

لہٰذا کیا یہ بات مناسب ہوگی کہ انسان دنیا کی چار روزہ زندگی سے دل لگا کر دائمی عذاب کا مستحق ہوجائے' اور دائمی جزا و پاداش سے محروم رہے؟

کیا اس صورت میں "نقد کو پکڑو' ادھار کو چھوڑو" والی بات کوئی اہمیت رکھتی ہے جب انسان سستی چیز کو اسکے نقد ہونے کی وجہ سے منتخب کر کے اسکے مقابل بعد میں ملنے والے کروڑوں ٹن سونے کو چھوڑ دے؟

ایک دانشور کے بقول' بالفرض محال اگر آخرت کے امور احتمالی ہوں' اور دنیا کے امور یقینی' تب بھی عقلمند انسان احتمال کی کروڑوں صدیوں کو یقین کے چند سال پر فدا نہیں کریگا۔ جبکہ ہم مسلمان معاد اور آخرت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں فنا ہوجانے والے اور چند روزہ نقد کے مقابل ہمیشہ اور جاویداں ادھار کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اسی بنیاد پر امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا تھا: والعجبُ کلَّ العجب للمصدّقِ بدارِ الخلود' وهو یعملُ لدارِ الغرور (انتہائی تعجب ہے ایسے شخص پر جو آخرت کے ہمیشہ رہنے والے ٹھکانے کی تصدیق کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس فریب اور فانی دنیا سے وابستگی اختیار کرتا ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۸ ص ۱۸۴)

نیز فرمایا ہے: فَلا تعدّن عیشاً منصرفاً عیشاً' مالکَ منهُ الاّ لذّةً تزدلف بکَ الی حمامِکَ (فانی اور ناپائیدار زندگی کو زندگی نہ سمجھو۔ تم نے کیوں دنیائے فانی سے (جو مجازی ہے اور) جس میں معمولی سی لذت کے سوا کچھ نہیں دل لگایا ہے' جبکہ یہ دنیا تمہیں موت سے نزدیک کر رہی ہے۔ بحارالانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۱۷۹)

یعنی اس سو سالہ دنیا کی لذت وعیش ونشاط میں غرق ہونا اس وقت کیا فائدہ دے گا جبکہ اس کے نتیجے میں خدا کے دائمی عذاب کا مزہ چکھنا پڑے۔ کیا اس طرح کے نقد کی لذت اس قدر اہم ہے کہ اس کی خاطر آخرت کی ہمیشگی اور دائمی لذت کو قربان کر دیا جائے؟

صبر واستقامت کی اہمیت

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوا ہے۔ قرآنِ مجید میں (سورۂ فرقان کی آیت ۶۳ سے لے کر ۷۴ تک میں) خدا کے ممتاز بندوں کی بارہ خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ پہلی پانچ خصلتیں اثباتی پہلو کی حامل ہیں اور خدا کے ممتاز بندے انہیں انجام دیتے ہیں۔ جبکہ ان کے بعد والی چار صفات وخصوصیات منفی پہلو کی حامل ہیں' جن سے خدا کے یہ ممتاز بندے دور رہتے ہیں۔ بعد کی تین خصوصیات (پھر) اثباتی پہلو رکھتی ہیں۔ لہٰذا اثبات سے نفی اور پھر نفی سے اثبات کی جانب یہ سفر شاید دو موضوعات ''تحلیہ'' اور ''تخلیہ'' کی جانب اشارہ ہو۔ (۱) کیونکہ علمِ اخلاق اور تہذیبِ نفس اِن دو اصولوں اور دو پہلوؤں کے گرد گھومتا ہے۔ لہٰذا خدا کے ممتاز بندوں کو دونوں ہی پہلوؤں میں قوی ہونا چاہئے۔ اُنہیں اپنے اندر سے منفی صفات نکالنے کیلئے مثبت قوتوں سے مدد لینی چاہئے اور فرشتے کو داخل کر کے شیطان کو باہر نکالنا چاہئے۔ کیونکہ مثبت قوتوں کے دباؤ ڈالے بغیر شیطان انسان کے اندر سے باہر نہیں نکلتا۔

۱۔ تحلیہ: یعنی نفس کو پسندیدہ انسانی صفات سے آراستہ کرنا۔ تخلیہ: یعنی روح کو ناپسندیدہ عادات اور مادّی آلودگیوں سے پاک کرنا۔ (مترجم)

یہ انتہائی قابلِ توجہ نکتہ ہے کہ خداوند کریم صاف اور واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ: یہ بارہ خصوصیات صبر واستقامت کے زیرِ سایہ حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی اگر انسان میں صبر کی قوت نہ ہو تو وہ خدا کے ممتاز بندوں کی خصوصیات حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا سورۂ فرقان کی آیت ۷۵ میں ہے کہ: اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا (یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کی بنا پر جنت کے اونچے اونچے محل عطا کئے جائیں گے)

اس عبارت کے ذریعے فضائل کے حصول اور رذائل سے پرہیز کے سلسلے میں صبر کے کردار کی انتہائی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگر صبر نہ ہو تو انسان ممتاز خصوصیات کا حامل نہیں ہو سکتا اور بلند درجات پر نہیں پہنچ سکتا۔

تجزیہ اور تحلیل

بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف "صبر" کے معنی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا اور ہر قسم کے دباؤ اور سختی کو برداشت کرنا نہیں ہے۔ اس قسم کے معنی سے عاجزی اور تظلم (یعنی ظلم کو قبول کرنا) جھلکتا ہے، جس سے اسلام سختی کے ساتھ روکتا ہے۔ بلکہ صبر کے اصل معنی امور کی انجام دہی کے لئے مضبوط عزم وارادے اور مسلسل اور لازوال ثابت قدمی کے ساتھ کام کو جاری رکھنا ہے۔

"مجمع بحرین" نامی لغت میں صبر کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اَلصَّبْرُ کَفُّ النَّفْسِ عَنْ هَوَاهَا (صبر یعنی نفس کا نفسانی خواہشات سے پرہیز کرنا یعنی نفسِ امارہ کے طاغوت کے خلاف جنگ کرنا۔ اور "المنجد" نامی لغت میں ہے کہ: صَبَرَ عَلَی الْاَمْرِ: جَرُءَ وَ شَجُعَ وَتَجَلَّدَ (کسی چیز پر صبر کے معنی ہیں اس کے بارے میں جرأت، شجاعت، ثابت قدمی اور شکست قبول نہ کرنا)

یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے آیاتِ قرآنی میں صبر واستقامت کو مجاہدین راہِ خدا کے لئے ایک بڑی شرط قرار دیا ہے: وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (اگر ان میں سے بیس افراد صابر ہوئے تو وہ دو سو افراد پر غالب آجائیں گے اور اگر سو افراد ہوئے تو وہ ایک ہزار افراد پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۵) یعنی ایک صابر انسان دشمن کے دس افراد کو زیر کر سکتا ہے۔ اگر صبر کے معنی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا ہوں تو ایسا صبر کبھی بھی انسان کو یہ قوت فراہم نہیں کرتا کہ وہ دس افراد کے مقابل کھڑا ہو کر انہیں شکست دیدے۔

اسی طرح قرآنِ کریم میں صبر کو ضعف و کمزوری کے مقابل قرار دیا گیا ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ صبر کے معنی استقامت اور پیہم جدوجہد ہے، جو ضعف و سستی کی ضد ہے۔ لہٰذا خداوند عالم فرماتا ہے: وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ (اور بہت سے ایسے نبی گزر چکے ہیں جن کے ہم رکاب ہو کر مردانِ الٰہی کے جمع کثیر نے اس انداز سے جنگ کی ہے کہ یہ لوگ راہِ خدا میں پڑنے والی مصیبتوں سے نہ کمزور ہوئے اور نہ بزدلی کا اظہار کیا اور نہ دشمن کے سامنے ذلت کا مظاہرہ کیا اور اللہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۴۶)

قرآنِ کریم میں دو سو سے زائد مرتبہ مسئلۂ صبر کو مختلف الفاظ اور بعض اوقات لفظ "استقامت" کے ذریعے بیان کیا گیا ہے (۱) اور اسکے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نکتے سے صبر واستقامت کی انتہائی بلند اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان آیات کے ذریعے مجموعی طور پر یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ صبر واستقامت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے، جتنی ہم سمجھتے ہیں۔ اسکی اہمیت کیلئے یہی بات کافی ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (بس صبر کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جنہیں بے حساب اجر دیا جاتا ہے۔ سورہ زمر ۳۹۔ آیت ۱۰)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اَلصَّبْرُ خَیْرُ مَرْکَبٍ مَا رَزَقَ اللّٰهُ عَبْدًا خَیْرًا لَهٗ وَلَآ اَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (صبر بہترین سواری ہے۔ خداوند عالم نے اپنے کسی

۱۔ معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم لفظ "صبر" اور "قوم" کے ضمن میں ملاحظہ فرمایئے۔

بندے کو صبر سے زیادہ بہتر اور وسیع تر روزی عطا نہیں کی ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۸۲۔ ص ۱۳۹)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی ایک گفتگو کے ضمن میں فرمایا ہے: عَلَیْکُمْ بِالصَّبْرِ، فَاِنَّ الصَّبْرَ مِنَ الایمانِ کَالرَّاسِ مِن الْجَسَدِ (تمہیں چاہئے کہ صبر و استقامت سے کام لو، کیونکہ صبر کو ایمان سے ویسی ہی نسبت حاصل ہے جیسی نسبت سر کو بدن سے ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۸۲)

ان عبارتوں سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کی تعمیر، تکمیل اور اسے پاک و پاکیزہ بنانے میں صبر و استقامت انتہائی اہم کردار کا حامل ہے۔ اور اسکے بغیر انسان ہرگز کمال حاصل نہیں کر سکتا اور آلودگیوں سے نجات نہیں پا سکتا۔ مولانا جلال الدین رومی کے بقول:

صد ہزار کیمیا حق آفرید
کیمیائی ہمچو صبر آدم ندید

(خدا نے لاکھوں کیمیا پیدا کئے ہیں، لیکن صبر کی طرح کا کوئی کیمیا انسان نے نہیں دیکھا)

عباد الرحمٰن کی ان بارہ خصوصیات سے صبر کا تعلق

متعدد روایات میں ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اَلصَّبْرُ ثَلاثَةٌ، صَبْرٌ عِنْدَ الْمُصِیبَةِ، وَصَبْرٌ عَلَی الطَّاعَةِ، وَصَبْرٌ عَلَی الْمَعْصِیَةِ (صبر کی تین قسمیں ہیں: مصیبت کے موقع پر صبر، اطاعت کی راہ میں صبر اور گناہ کے مقابل صبر)

یہی حدیث حضرت علی علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے، اور اسکے آخر میں یہ بھی ہے کہ: گناہ کے مقابل صبر، ان دو پہلی قسموں کی نسبت زیادہ بلند درجہ رکھتا ہے۔ (اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۹۱، میزان الحکمۃ۔ ج ۵۔ ص ۲۶۷)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک دوسری روایت میں فرمایا ہے کہ: اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ، صَبْرٌ عِنْدَ الْمُصِیبَةِ حَسَنٌ جَمِیلٌ، وَاَحْسَنُ مِنْ ذٰلِکَ الصَّبْرُ عِنْدَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَیْکَ (صبر دو طرح کا ہے: مصائب و مشکلات کے سامنے صبر، کہ یہ صبر

خوبصورت اور عمدہ ہے اور اس صبر سے زیادہ عمدہ ان امور کے مقابل صبر ہے جنہیں خداوند عالم نے حرام قرار دیا ہے۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۹۰)

ان دو احادیث کی رو سے صبر و استقامت کی وہی تین جڑیں اور بنیادیں ہیں۔

جب ہم خدا کے نزدیک امتیازی مقام رکھنے والے بندوں کی ان بارہ خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں اور ان پر گہرا غور و فکر کرتے ہیں، تو یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی خصوصیت صبر و استقامت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اور ان بارہ خصوصیات کے حصول کیلئے صبر و استقامت کی مدد لینے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، ان میں سے چار خصوصیات منفی پہلو کی حامل ہیں اور ان کے خلاف جنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خصوصیات صرف گناہ کے مقابل صبر کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ جبکہ چھے خصوصیات مثبت پہلو رکھتی ہیں، جو راہِ اطاعت میں صبر کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔

لہٰذا ہمیں چاہئے کہ تمام پہلوؤں میں، بالخصوص گناہ سے مقابلے اور اطاعت کی راہ میں صبر کو اپنی روح و رواں میں جگہ دیں، تا کہ یہ بارہ خصوصیات حاصل کر سکیں۔

جی ہاں، صبر و استقامت بہترین نتائج کا حامل ہوتا ہے اور اسکے بغیر انسان کسی صورت اعلیٰ انسانی اقدار تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی وجہ سے (جیسا کہ ہم نے کہا) قرآنِ کریم نے مختلف الفاظ کے ذریعے دو سو سے زائد مرتبہ مسلمانوں کو صبر و استقامت کی دعوت دی ہے اور انہیں صبر کی عظیم طاقت سے مدد لینے کی تلقین کی ہے۔ قرآنِ کریم ایک مقام پر واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگو۔ بیشک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۵۳)

فرامینِ معصومین میں صبر کے اثرات اور اس کا کردار

صبر اور اسکے بہترین اثرات کی زیادہ سے زیادہ اہمیت جاننے کے لئے اور اس بات سے واقف ہونے کیلئے کہ فضائل سے آراستہ ہونے، رذائل سے پیراستہ ہونے اور زندگی کے مختلف مسائل میں سدھار اور سنوار پیدا کرنے کے سلسلے میں صبر ایک انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے، آیئے

آپ کو پیغمبر اسلام اور ائمہ معصومین کے کچھ فرامین کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلصَّبرُ کَنزٌ مِنْ کُنُوزِ الجنّةِ (صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ المحجۃ البیضاء۔ ج ۷۔ ص ۱۰۷)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اَلصَّبرُ مَطِیَّةٌ لاتَکبُو (صبر ایسی سواری ہے جو کسی صورت زمین پر نہیں گرتی۔ بحار الانوار۔ ج ۶۸۔ ص ۹۶)

حضرت علی علیہ السلام ہی کا ارشاد ہے: اَلصَّبرُ عَونٌ علی کُلِّ امْرٍ (صبر تمام امور میں انسان کا یاور و مددگار رہتا ہے۔ غرر الحکم)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہی کا ارشاد ہے: عَلیکُم بالصَّبرِ فانَّهُ لادینَ لِمَنْ لاصَبرَ لَهُ (تمہیں چاہئے کہ صبر و استقامت سے کام لو۔ ایسا شخص جس میں صبر و استقامت نہ ہو اس کا دین نہیں۔ بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۹۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: کَمْ مِنْ صَبْرِ ساعةٍ قَدْ اوْرَثَتْ فَرَحاً طَویلاً (بہت مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ساعت کا صبر طویل خوشیوں کا باعث بن جاتا ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۹۱)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پرہیزگاروں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: صَبَروا ایّاماً قَصیرَةً اَعْقَبَتْهُمْ راحَةً طَویلَةً (ان لوگوں نے دنیا کے چند دنوں میں صبر کیا اور اسکے نتیجے میں آخرت میں طولانی آسائشیں حاصل کیں۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۳)

امام علی علیہ السلام ہی نے فرمایا ہے: عَلامةُ الصّابرِ فی ثلاثٍ: اوّلُها ان لا یَکسِلَ والثّانیةُ انْ لایَضجَرَ والثّالثةُ انْ لایشکُرَ مِنْ رَبِّهِ عَزَّوجَلَّ (صبر کرنے والوں کی تین نشانیاں ہیں: (۱) اپنے آپ سے بے حوصلگی کو دور کرنا۔ (۲) بے قراری اور دلتنگی سے دوری۔ (۳) خداوند عالم سے گلہ نہ کرنا۔ بحار الانوار۔ ج ۷۱۔ ص ۸۶)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہی نے فرمایا ہے کہ: مِفتاحُ الظَّفَرِ لُزُومُ الصَّبرِ (صبر و شکیبائی کامیابی کی کنجی ہے۔ غرر الحکم۔ حدیث ۹۸۰۹)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: قِلَّةُ الصَّبرِ فَضیحَةٌ (صبر کی کمی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ بحار الانوار۔ ج ۷۸۔ ص ۲۶۹)

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: جب انسان کو قبر میں رکھتے ہیں تو اسکے دائیں طرف نماز' اسکے بائیں طرف زکات اور اسکے سر کی جانب نیکیاں کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایک طرف ان سے ذرا دور صبر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر جب سوال کرنے والے دو فرشتے اسکے پاس آتے ہیں' تو صبر (جو نورانی صورت لئے ہوتا ہے) نماز' زکات اور نیکیوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ: دُونَکُمْ صاحِبَکُمْ فانْ عَجَزْتُم عَنهُ فَانادُونَهُ (اپنے صاحب کی طرف سے ہوشیار رہو' اگر اسے عذاب سے محفوظ رکھنے میں ناکام ہو' تو میں اسکی حفاظت کے لئے حاضر ہوں۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۹۰)

یہ احادیث انسان کی مادّی' معنوی' دنیاوی اور اُخروی کامیابیوں میں صبر و استقامت کے کردار کی نشاندہی کرتی ہیں اور زبانِ قال و حال سے کہتی ہیں کہ:

صبر و ظفر ہردو دوستانِ قدیمند

بر اثر صبر نوبتِ ظفر آید

(صبر و ظفر دونوں قدیمی دوست ہیں' صبر کے اثر سے ظفر کی نوبت آتی ہے)

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اھلبیت(ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

﴿التماس سورۃ الفاتحہ﴾

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوزر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امِّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان

Hassan
naqviz@live.com